چمنستان

رام رتن مضطر

چمنستان

رام رتن مضطر

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

ناشر رام رتن مضطرؔ

مطبع جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

سالِ طباعت، اکتوبر ۱۹۸۲ء

تعداد چار سو

کاتب محمد الیاس۔ سکندرآباد۔ یو۔پی

قیمت پندرہ روپیے

ملنے کا پتہ

آزاد بک ڈپو، ہال بازار امرتسر

پتہ: قصرِ اردو - اردو بازار - دہلی ۶

ترتیب

چمنستان	۵ تا ۱۰۶
دستۂ گُل	۱۰۷ تا ۱۴۸
پنکھڑیاں	۱۴۹ تا ۱۶۰

مُبتلا رنج میں ہے آج کا انسان بہت
صورتِ حال کے ہاتھوں ہے پریشان بہت

کون کہہ سکتا ہے کس وقت بشر گر جائے
کہ یہاں گرنے کے ہر وقت ہیں امکان بہت

دیکھنے ہیں کوئی قیمت ہو چُکانے والا
بیچتے پھرتے ہیں بازار میں ایمان بہت

ظلم کرنے میں تامل نہ تھا کل تک جن کو
آج وہ اپنے کئے پر ہیں پشیمان بہت

منزلِ عشقِ حقیقت میں بہت ہے دشوار
دیکھنے میں نظر آتی تھی جو آسان بہت

کفر و ایماں کا یہ سنگم ہے خدا کی قدرت
پُوجنے والے ہیں اُس بُت کے مسلمان بہت

عذر تو کوئی نہیں غیر سے ملنے میں مجھے
ڈر فقط یہ ہے کہ کم بخت ہے شیطان بہت

تیری کشتی کو خداوند سلامت رکھے
کہ ترے قلزمِ ہستی میں ہیں طوفان بہت

مضطرؔ اب دیکھئے انجامِ محبت کیا ہو
دوست بھی ہم کو ملا وہ جو ہے نادان بہت

واعظ جلیں گے آگ میں سب گنہگار کیا
رندوں کو بھی نہ بخشے گا پروردگار کیا

فکرِ معاش ہے نہ غمِ عشق کوئی اب
آرام سے گزرتے ہیں لیل و نہار کیا

سب کچھ وہ جانتے ہیں انہیں کیا نہیں خبر
اُن سے میں عرضِ حال کروں بار بار کیا

اگلی بہاریں تو جلا آشیاں مرا
دیکھیں کہ گُل کھلاتی ہے اب کے بہار کیا

جو لوگ چین پا نہ سکے عمر بھر کہیں
سوئے پڑے ہیں چین سے زیرِ مزار کیا

کیونکر تمہارے وعدۂ فردا کی ہو خوشی
اقرارِ سہل کا ہو مجھے اعتبار کیا

دو آنسوؤں میں کہہ دیا سب ماجرائے دل
اِس سے زیادہ اور کروں اختصار کیا

میرے جنونِ عشق سے چمکا ترا جمال
میں نے کیا جہاں میں ترا اشتہار کیا

مضطر یہ غم ہی ایک دن کھا جائیگا تجھے
کھائے گا تیرا غم تو کوئی غمگسار کیا

وہ خوبرُو الگ ہے تو ہے خوش گلُو الگ
خوبی ہے اور یہ کہ ہے وہ نیک خُو الگ

یہ کائنات ایک ہے گلدستۂ حسین
جس کے ہر ایک پھول کی ہے رنگ و بُو الگ

نفرت نہیں یہ مجھ سے تو ساقی ہے اور کیا
تُو نے رکھا ہے میرے لئے اِک سبُو الگ

آئیں گے آپ آئینگے محفل میں ایک دن
رہنے نہ دے گا آپ کو شوقِ نمُو الگ

قرباں تیری حکمتِ عملی کے جائیے
مجھ سے الگ ہے غیر سے ہے گفتگُو الگ

مجھ کو بھی دے جو تُو نے دیا ہے جہان کو
میری نہیں جہاں سے کوئی آرزُو الگ

شاعر کے دل میں بھی ہے تری دید کی ہوس
کرتا ہے فلسفی بھی تری جستجُو الگ

نادان کے لئے تو نہیں فرق کچھ، مگر
دولت ہے ایک چیز الگ، آبرُو الگ

مضطر یہ نکتہ تیرے سمجھنے کا ہے سمجھ
تجھ سے نہ میں الگ ہوں ہی مجھ سے تُو الگ

یہ تاب یہ مجال کہاں خاکسار کی
خواہش کروں جو حُسن کے اس تاجدار کی

پتھرا گئی ہیں آنکھیں ترے انتظار میں
آخر ہے کوئی حد بھی ترے انتظار کی

صیّاد دیکھ تو لینے دے لُطف اَب بہار کا
کب سے دعائیں مانگتے تھے ہم بہار کی

اک پھول بھی نصیب نہیں جس بہار میں
کرتے رہے دعائیں ہم کیا اس بہار کی

آپ آئے اور آتے ہی آتے چلے گئے
تسکین ہو سکی نہ دلِ بے قرار کی

تم جھوٹ بھی کہو گے تو میں سچ ہی مان لوں
دراصل ساری بات ہے یہ اعتبار کی

بدلا زمانہ اور زمانے کے ساتھ ہی
حالات نے بھی شکل نئی اختیار کی

مضطرؔ مجھے نصیب ہیں دُنیا کی نعمتیں
رحمت ہے مجھ پہ یہ مرے پروردگار کی

ملا ہوں آپ سے یوں تو میں بارہا پہلے
مگر جو آج کرم ہے کبھی نہ تھا پہلے
قصور وار سبھی نے مجھی کو ٹھہرایا
کسی نے دیکھا نہ کس کی تھی ابتدا پہلے
نہ دیکھ پاؤں ترا رنج اپنی آنکھوں سے
اُٹھالے بزمِ جہاں سے مجھے خدا پہلے
کرم جو پیرِ مُغاں کا کسی پہ ہو جائے
وہ رند بعد میں بنتا ہے پارسا پہلے
حصولِ کار کو لازم ہے دُور اندیشی
ہر ابتدا میں نظر آئے انتہا پہلے
زمانے والے اُسے بیوقوف کہتے رہے
کوئی جو اپنے زمانے سے آگیا پہلے
فریب و مکر مجسم ہیں آج کے احباب
وفا و مہر کے پیکر تھے آشنا پہلے
سوائے دردِ محبت کے روئے عالم پر
ہر ایک درد کی موجود تھی دوا پہلے
اَب اور بات کوئی ہو گی بعد میں مضطر
بیاض کھول، ادھر آ، غزل سُنا پہلے

تو نے اک کھیل نیارا ہی رچا رکھا ہے
کہ ہمیں لا کے یہاں پردہ گرا رکھا ہے
غم اگر یاد رہیں زندگی دوبھر ہو جائے
اس لئے ہم نے ہر اک غم کو بھلا رکھا ہے
ایک دن اُٹھے گا وہ لے کے بغاوت کا علم
تو نے جس شخص کو طاقت سے دبا رکھا ہے
جانے کیا ہوتا جو کچھ دل کی بضاعت ہوتی
ایک ہی قطرے نے طوفان اٹھا رکھا ہے
مسکراہٹ تو لبوں پر ہے دکھاوے کیلئے
میں نے ہر رنج مگر دل میں چھپا رکھا ہے
ہائے کیا چیز تعصب کا ہے جادو جس نے
ہوشمندوں کو بھی دیوانہ بنا رکھا ہے
تیرے در سے نہ گیا کوئی سوالی خالی
تو نے ہر ایک پہ در اپنا کھلا رکھا ہے
نام تم کوئی رکھو گل تو رہے گا گل ہی
رنگ و بو تو ہے وہی نام ہی کیا رکھا ہے
عشق پابند نہیں رنگ و نسل کا مضطر
دنیا والوں نے یونہی شور مچا رکھا ہے

ترے عاشق کبھی فرشِ زمیں پر
کبھی اُڑتے ہیں وہ عرشِ بریں پر
حضور آئے کہاں سے جب یہ پوچھا
پسینہ آ گیا اُن کی جبیں پر
توقع ہی نہ تھی اس سے زیادہ
مجھے حیرت نہیں تیری "نہیں" پر
کوئی اب تک نہ لوٹا تجھ سے بچ کر
ترے ہمراہ چلوں تو کس یقیں پر
یونہی ہوتی گئیں جو منزلیں طے
تو اک دن جا ہی پہنچوں گا کہیں پر
تُو کیا جانے ارے او محوِ عشرت
جو گزری ہے مری جانِ حزیں پر
کوئی خونیں کہانی کہہ رہے ہیں
یہ چھینٹے جو ہیں تیری آستیں پر
کبھی فرصت ملے تو اس طرف آ
کرم کر مضطرِ گوشہ نشیں پر

آئے نجھے اپنی زلیست میں کچھ دن بہار کے
اب سوچ میں پڑا ہوں کب آئے کدھر گئے
رشتہ ہی جبکہ ٹوٹ گیا درمیان کا
پھر ایک ایک کر کے سب موتی بکھر گئے
جس دَور کی کہانیاں کرتے ہو تم بیاں
وہ وقت اَب نہیں وہ زمانے گزر گئے
یارب کسی پہ وقت مصیبت نہ آپڑے
سب دوست آج آنکھیں چرا کر گزر گئے
سچ ہے کہ ہر کمال کا انجام ہے زوال
چڑھ چڑھ کے اپنے آپ ہی دریا اُتر گئے
صدیوں سے محوِ کار رہے مشّاطۂ ازل
یوں ہی نہیں کہ گیسوئے ہستی سنور گئے
تعریف کیا کروں میں دبستانِ عشق کی
بگڑے ہوئے بھی آئے یہاں تو سدھر گئے
کچھ لوگ تھے جو مر کے بھی زندہ رہے مدام
کچھ لوگ وہ بھی ہیں کہ جو زندہ ہی مر گئے
مضطرؔ حکیم وقت کا کیسا کمال ہے
کتنے شدید زخم تھے جو خود ہی بھر گئے

اِک تری ذاتِ مقدس کے سوا
ہر بُرائی سے مبرّا کون ہے
اپنے گرد و پیش سے پیوست رہ
یہ نہ ہرگز کہہ کہ میرا کون ہے
پیار تو سارے ہی کرتے ہیں مگر
دیکھنا یہ ہے تڑپتا کون ہے
اِک بڑا نقار خانہ ہے جہاں
ایسے میں طوطی کی سُنتا کون ہے
جُھوٹ کی دنیا کے اس ماحول میں
کون پہچانے کہ سچّا کون ہے
غور کر ناداں کبھی اس بات پر
کون اپنا ہے پرایا کون ہے
سب کو دیتا ہے وہ داتا صبح و شام
کوئی بندہ دینے والا کون ہے
کیوں عزیزوں کا گلہ کرتے ہو تم
مضطرؔ اس دنیا میں اچھا کون ہے

بارہا ایسا بھی وقت آتا رہا
آدمی حیوان بن جاتا رہا
بن گئی دنیا درندوں کا وطن
آدمی کو آدمی کھاتا رہا
میں جدائی کے عذاب و کرب میں
تیرے خط سے جی کو بہلاتا رہا
عقل پھیلاتی رہی خوف و ہراس
عشق خونِ زیست گرماتا رہا
عشق نے بخشی ہمیں آسودگی
حسن قلب و جاں کو تڑپاتا رہا
بے عمل عالم ہے وہ جو عمر بھر
کاغذی گھوڑے ہی دوڑاتا رہا
آفریں صد آفریں اُس مرد پر
جو مصیبت میں بھی مُسکاتا رہا
یاد ہیں وہ دن کہ نادانی سے میں
اپنے سائے سے بھی گھبراتا رہا
اک نہ مانی مضطرؔ اس کم بخت نے
میں برابر دل کو سمجھاتا رہا

محبت میں کمالِ ضبط سے ہم کام لیتے ہیں
ترا جب ذکر آتا ہے کلیجہ تھام لیتے ہیں
محبت میں عبادت کا بھی یوں ہم کام لیتے ہیں
تمہاری یاد آنے پر خدا کا نام لیتے ہیں
گلوں کی خوشنمائی اور خوش رنگی بجا لیکن
گلوں سے خار اچھے ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں
خوشی سے تو ہمیں الزام پر الزام دیتا جا
خوشی سے ہم ترے الزام پر الزام لیتے ہیں
مٹایا خوف دل سے ہر بلائے ناگہانی کا
بلائیں ہم تری اے گردشِ ایام لیتے ہیں
سکوں سے بیٹھنے والوں کو کوئی کچھ نہیں دیتا
اُنہی کو جام ملتا ہے جو بڑھ کر جام لیتے ہیں
ستم ڈھانا تمہیں بھاتا ہے اور ہم کو ستم سہنا
نہ تم آرام لیتے ہو نہ ہم آرام لیتے ہیں
خیالِ توبہ رکھتے ہیں یہاں تک ہم کہ اے مضطر
برائے نام وہ اک جام صبح و شام لیتے ہیں

پتہ نہ تُو نے کسی بھید کا دیا مجھ کو
بنایا اور بنا کر مٹا دیا مجھ کو
متاعِ دردِ محبت کے بانٹنے والے
تجھے خبر ہی نہیں تُو نے کیا دیا مجھ کو
نظر سے دُور ہوا دل سے بھی میں دُور ہوا
کہ میرے بعد سبھی نے بھلا دیا مجھ کو
میں دیکھتا تھا کہ غیروں نے تیری شہ پا کر
ذلیل کر کے سرِ بزم اُٹھا دیا مجھ کو
رہا نہ ہوش مجھے کوئی دین و دنیا کا
یہ تُو نے کیا مرے ساقی پلا دیا مجھ کو
بجا نہ لاؤں جو شکر اُس کا کفرِ نعمت ہے
مری طلب سے خدا نے سوا دیا مجھ کو
غرور تھا مجھے اُس بے وفا کی الفت پر
مرے غرور نے نیچا دکھا دیا مجھ کو
کیا جو وعدہ خلافی کا مضطر اُن سے گلہ
کوئی بہانہ بنا کر سُنا دیا مجھ کو

چین دم بھر نہیں ملتا مجھے ارمانوں سے
تنگ آیا ہوں میں اِن روز کے مہمانوں سے

زاہدِ تنگ نظر سمجھے تو سمجھے کیوں کر
کافر اچھے ہیں دل آزار مسلمانوں سے

جن میں ہوتی نہیں انسانیت ایسے انساں
ہرگز انساں نہیں بدتر ہیں وہ حیوانوں سے

مجھ کو دارا نہ سکندر کے سناؤ قصے
جی بہلتا ہے مرا عشق کے افسانوں سے

ہم کبھی ہوتے تھے کبھی تیرے یگانوں میں شمار
آج پھرتے ہیں ترے شہر میں بیگانوں سے

تیرے اعلان وہی میری وہی بدحالی
میرا کچھ حال نہ سُدھرا ترے اعلانوں سے

ناحق اتنا نہ ہو اے ناصحِ ناداں برہم
ہوش والے تو اُلجھتے نہیں دیوانوں سے

اُن کے وعدوں کو تو عنوان بنائے مضطرؔ
قصّہ کر اپنا مرتب انہی عنوانوں سے

جو یہ ہے عالمِ طفلی شباب کیا ہوگا
جہانِ حُسن میں تیرا جواب کیا ہوگا

نہ عرضِ شوق کی جرأت نہ تابِ غم ہے تجھے
میں سوچتا ہوں کہ تُو کامیاب کیا ہوگا

عُدو کے ساتھ وہ آئے مری عیادت کو
اگر ثواب یہی ہے عذاب کیا ہوگا

وہ جھوٹی موٹی تسلّی تو کوئی دیں گے ضرور
میں جانتا ہوں کہ کورا جواب کیا ہوگا

ڈرا رہے ہیں یونہی ہم کو حضرتِ واعظ
کسے خبر ہے کہ روزِ حساب کیا ہوگا

کرے گا تو ہی یہ دُنیائے دل تہ و بالا
کسی سے تیرے سوا انقلاب کیا ہوگا

تو مشقِ ناز کیے جا مرا خیال نہ کر
خرابِ حال زیادہ خراب کیا ہوگا

جو تم سے پوچھ لیں مضطرؔ وہ مقصد آنے کا
تمہارے پاس بتاؤ جواب کیا ہوگا

قرینہ تجھ کو نہ آیا اگر محبت کا
سلیقہ آئیگا کیوں کر تجھے عداوت کا

جو بات کہنے کی تھی میں نے اس لئے نہ کہی
کہ اُن پہ راز نہ کھُل جائے میری اُلفت کا

ملیں گے ہم کو فراغت میں دوست بہتیرے
ملے گا کوئی نہ ساتھی مگر مصیبت کا

سفرِ حیات کا تیزی سے ختم ہونے لگا
قریب آگیا وقت اس جہاں سے رخصت کا

میں سجدہ کرتا ہوں بُت کو تو بات کیا اے شیخ
جُدا ہے تجھ سے طریقہ مری عبادت کا

پہاڑ کاٹ کے لانا کسی کا جوئے شیر
کرشمہ ایک ہے ادنےٰ سا یہ محبت کا

ہوا نہ عشق مکمل کوئی جُنوں کے بغیر
رہِ وفا میں ہے اپنا مقام وحشت کا

یہ دَور کذب و رِیا کا ہے دَورائے مضطر
فضول ذکر ہے اس دَور میں صداقت کا

ماہِ مبیں نہ مہرِ منوّر کی بات ہے
موضوعِ گفتگو مرے دلبر کی بات ہے
سننا ہے ذوق و شوق سے ہر ایک میگسار
ساقی کے لب پہ بادہ و ساغر کی بات ہے
کچھ لطف آ رہا ہے مجھے لفظ لفظ میں
کیونکر نہ ہو یہ میرے ستم گر کی بات ہے
دَورِ خزاں گیا کریں کانٹوں کی بات کیوں
اَب موسمِ بہار و گُلِ تر کی بات ہے
اِس دَور میں ہے حرفِ غلط نا برابری
ہر ایک لب پر آج برابر کی بات ہے
ہو گا نیاز مند سے افشا نہ کوئی راز
بیخوف آپ دل کی کہیں گھر کی بات ہے
پاتے ہیں بار اہلِ ریا بزمِ ناز میں
یہ سب غلط نوازی دلبر کی بات ہے
کوئی رہینِ غم ہو کوئی دادِ عیش دے
مضطرؔ یہ اپنے اپنے مقدّر کی بات ہے

کعبہ نہیں دیکھا کہ کلیسا نہیں دیکھا
اے دوست تری راہ میں کیا کیا نہیں دیکھا
کیا جانئے کیوں مفت میں دل ہو گیا بدنام
آتا نہیں دیکھا کہیں جاتا نہیں دیکھا
چڑھتا ہوا دن دیکھا ہے ڈھلتا ہوا دن بھی
اِن دیکھتی آنکھوں نے یہاں کیا نہیں دیکھا
جاتی ہی نہیں دل سے مرے حسرتِ دیدار
دیکھا بھی اُسے میں نے تو گویا نہیں دیکھا
کہنے کو سبھی ہیں کہ نہ فرقت میں جئیں گے
فرقت میں مگر کوئی بھی مرتا نہیں دیکھا
ہر وقت ہجومِ غم و آلام ہے دل میں
اس دل کو کسی وقت بھی تنہا نہیں دیکھا
وہ دیکھے اُس مستِ جوانی کو خراماں
جس نے کبھی بہتا ہوا دریا نہیں دیکھا
مضطر ہے بتوں سے تجھے اُمید وفا کی
تجھ سا بھی کہیں ہم نے کوئی دانا نہیں دیکھا

کچھ اعتدال پسند ایسی زندگی پائی
نہ غم ہی پایا زیادہ نہ سرخوشی پائی
مجھے نہ کوئی گلہ تھا مگر ہوا اُس وقت
تمہارے جورو ستم میں بھی جب کمی پائی
میں عرضِ حال کو آیا تو تھا مگر اے دوست
تری طرف سے بدستور بے رُخی پائی
کچھ ایسی سادہ طبیعت ملی ازل سے مجھے
کبھی نہ میں نے بناوٹ میں دلکشی پائی
جہانِ عشق میں دیکھا وہ یاس کا عالم
کہ ایک ایک کے چہرے پہ بے دلی پائی
کسی کے غم کا نہیں کوئی چارہ ساز یہاں
عجیب ہم نے زمانے میں بے حسی پائی
اُسے ہو گریۂ شبنم کا کس طرح احساس
وہ جس نے قطرۂ شبنم میں تازگی پائی
نہ زندگی ہی پہ بس ہے نہ موت پر مضطر
ہمیشہ ہم نے محبت میں بے بسی پائی

لب کشائی بھی ہے دشوار سخن ور کیلئے
ضبط کرنا بھی ہے مشکل دلِ مضطر کیلئے

جامہ زیبی کا یہ عالم ہے کہ ہر ایک لباس
جیسے قدرت نے بنایا ترے پیکر کے لئے

دیکھ اُس در کے سوا سر نہ جھکے اور کہیں
یہ جبیں تیری نہیں اور کسی در کے لئے

ابھی بیدار نہیں دیدۂ باطن میرا
ابھی بے تاب ہوں میں جلوۂ ظاہر کے لئے

کس لئے حُسن رکھے غازہ و زیور کو عزیز
حُسن محتاج نہیں غازہ و زیور کے لئے

غم ہے ایسا کہ کسی کو نہ بتایا جائے
دل میں رکھنے کی ہے یہ شئے نہ کہ باہر کے لئے

جا بجا خار بھی پہلوئے گُل تر میں ہیں
سوچ کر ہاتھ بڑھانا گلِ تر کے لئے

ان خیالاتِ پریشاں کا بُرا ہو مضطر
جن سے راحت نہ ملی رات کو دم بھر کیلئے

کیسی تبدیل ہوئی کون و مکاں کی صورت
وہ نہ صورت ہے یہاں کی نہ وہاں کی صورت

جان اور مال کو ہر وقت ہے خطرہ لاحق
خوب دیکھی ہے یہاں امن و اماں کی صورت

بدگماں میں ہوں اگر آپ بھی سوچیں دل میں
کیسے پیدا ہوئی آخر یہ گماں کی صورت

غیر کی خیر مگر بول تمہارے اے دوست
چبھ گئے دل میں مرے تیر و سناں کی صورت

اہلِ مے خانہ کی ہو جاتی ہے دنیا اندھیر
جب نظر آتی نہیں پیرِ مغاں کی صورت

خاک ہر خطۂ دنیا کی تو چھانی ہم نے
نظر آئی نہ مگر کوئی اماں کی صورت

اختیار آپ ہی عشاق نے کی راہِ زباں
ورنہ الفت میں نہ تھی کوئی زباں کی صورت

لکھنؤ اور نہ دلی سے ہے نسبت مضطرؔ
شعر کہتا ہوں مگر اہلِ زباں کی صورت

اضطرابِ دلِ برباد ہے باقی یارو
عہدِ ماضی کی ابھی یاد ہے باقی یارو
میری تقدیر میں فریاد ہے باقی یارو
ابھی کچھ قید کی میعاد ہے باقی یارو
جاں نثارانِ محبت کی ہے اب بھی توقیر
عظمتِ تیشہ و فرہاد ہے باقی یارو
کیا کہوں تم سے دلِ زار کی ایذا طلبی
حسرتِ لذتِ بیداد ہے باقی یارو
مل ہی جائے گا کبھی گوہرِ مقصود آخر
اور کچھ محنتِ برباد ہے باقی یارو
اہلِ دیں نے اُسے ہر چند مٹانا چاہا
کچھ تو ہے پھر بھی جو الحاد ہے باقی یارو
کیسے ہو سکتی ہے پنجاب میں اردو نابود
جب وفا سا کوئی اُستاد ہے باقی یارو
مضطر اسکی بھی دل و جاں سے کریگا تعمیل
کہہ دو بے ٹوک جو ارشاد ہے باقی یارو

عشق رُوحِ بشر کی دولت ہے
حُسن قلب و نظر کی جنت ہے

تیری قسمت بُری نہیں لیکن
تیری قسمت بقدرِ ہمّت ہے

دیر کرنے کا عذر چھوڑ اے دوست
اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے

اِک نظر ہو اداشناس اگر
ساری دنیا ہی خوب صورت ہے

بے ضرورت نہیں یہاں کوئی
ہر کسی کی یہاں ضرورت ہے

آپ سے حالِ زار کیا کہئے
شکر ہے آپ کی عنایت ہے

کون رازِ جہاں پہ غور کرے
اِس زمانے میں کس کو فرصت ہے

ویسی ویسی ہی پا رہا ہے مراد
جیسی جیسی کسی کی نیّت ہے

اُن کی باتوں پہ تو نہ جا مضطر
نکتہ چینوں کی تو یہ عادت ہے

اب جو ہنستے ہیں مجھے ناچیز قطرہ دیکھ کر
کل وہی حیران ہوں گے مجھ کو دریا دیکھ کر

پھر کوئی لطف و کرم کی بارشیں کرنے لگا
پھر مجھے آمادۂ ترکِ تمنّا دیکھ کر

چاہنے والے بھی تیرے کس قدر ہیں نکتہ داں
خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

ہر کوئی کرتا ہے مجھ سے سرد مہری کا سلوک
جلتا ہوں طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا دیکھ کر

میکشی سے توبہ تو کر لی مگر اب کیا کروں
مُنہ میں بھر آتا ہے پانی جام و مینا دیکھ کر

تجھ کو یہ معلوم ہو کوئی پسِ پردہ بھی ہے
ایکہ تو مایوس ہو بیٹھا ہے پردا دیکھ کر

ہر کسی کے دل میں ہے اک شیخ چلّی محوِ کار
ہر کوئی خوش ہو رہا ہے خوابِ فردا دیکھ کر

یہ جنونِ عشق کے انداز مضطرؔ چھوڑ اب
انگلیاں اٹھتی ہیں تجھ پر حال تیرا دیکھ کر

غریبوں سے ہمیشہ برسرِ پیکار ہے دنیا
امیروں کی مگر ہر وقت خدمتگار ہے دنیا
بڑی مکّار ہے دنیا بڑی عیّار ہے دنیا
بڑی پُرکار ہے دنیا بڑی ہشیار ہے دنیا
خدا وندا کوئی تسکین کا سامان پیدا کر
غریبوں کیلئے دن رات کا آزار ہے دنیا
کبھی رنج و غم و آلام کا دشتِ لق و دق ہے
کبھی عیش و مسرّت کا کھِلا گلزار ہے دُنیا
خدا کا خوف بھی لازم ہے ہر دم اہلِ دولت کو
اگر ہے دین سے عاری تو پھر بے کار ہے دُنیا
کسی حالت میں اس کی زد سے کوئی بچ نہیں سکتا
دو دھاری نام ہے جس کا یہ وہ تلوار ہے دنیا
مصیبت میں جو اپنوں نے بھی تجھ سے پھیر لیں آنکھیں
تو اس میں کیا عجب مضطرؔ یہ آخر کار ہے دُنیا

عطا ہم کو نگاہِ مست سے اک جام ہو جائے
ہمارا کام ہو جائے تمہارا نام ہو جائے

اُٹھو اے میکشو پھر ایک دورِ جام ہو جائے
کسی صورت علاجِ گردشِ ایام ہو جائے

ٹھکانہ ایک در کر کے پڑا رہ اس طرح اُس پر
وہیں پر صبح ہو تیری وہیں پر شام ہو جائے

نہ سمجھے شومئی تقدیر وہ اس کو تو کیا سمجھے
کہ ہر تدبیر جس کم بخت کی ناکام ہو جائے

نظر عبرت نشی کر تو میرے انجامِ محبت پر
کہیں تیرا بھی اے بلبل نہ یہ انجام ہو جائے

کھڑی ہو موت بھی سر پر تو ناممکن نہیں ہرگز
ترا حرفِ تسلی زیست کا پیغام ہو جائے

تمہاری نیک نامی کے ہیں چرچے ہر جگہ مضطر
زمانے میں نہ تجھ سا بھی کوئی بدنام ہو جائے

ہر غم کو ہر ملال کو اپنا رہا ہوں میں
یوں اپنے دل پہ آپ ستم ڈھا رہا ہوں میں
اُٹھا تھا راہِ شوق میں بس اک قدم غلط
اب تک اُسی خطا کی سزا پا رہا ہوں میں
مالا ترے ہی نام کی جپتا ہوں رات دن
تیرے ہی گیت شام سحر گا رہا ہوں میں
اپنی تمام اُلجھنوں سے ہو کے بے نیاز
سارے جہاں کی اُلجھنیں اپنا رہا ہوں میں
ہر چند وقفِ رنج و غم و یاس ہوں مگر
دل کو ترے خیال سے بہلا رہا ہوں میں
یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا فریب ہے
دنیا پہ اعتبار کئے جا رہا ہوں میں
ناصح مری خطا پہ ملامت نہ کر مجھے
اپنی خطا پہ آپ ہی پچھتا رہا ہوں میں
مضطرؔ یہ زہدِ خشک کا ماحول الاماں
جنت کی بود و باش سے گھبرا رہا ہوں میں

غمِ دوراں سے نجات اے دلِ ناشاد نہ ڈھونڈ
ہو گی مشکل ہی سے آسان یہ مشکل تیری

ایسی نا قدریٔ احباب کہاں تھی پہلے
دیکھتے دیکھتے کیا ہو گئی محفل تیری

کبھی ہنستے تجھے دیکھا کبھی روتے پایا
کیفیت جان سکا کوئی نہ اے دل تیری

جو بھی نکلا تری محفل سے پریشاں نکلا
راس آئی نہ کسی شخص کو محفل تیری

اپنی محرومیٔ تقدیر پہ کیوں روتا ہے
اس میں کوتاہیٔ تدبیر ہے شامل تیری

وہ کسی حال میں خوش رہ نہیں سکتا اے دوست
جس کو خوشنودیٔ خاطر نہیں حاصل تیری

پیچ در پیچ محبت کی ہیں راہیں مضطر
تو سمجھتا ہے کہ آسان ہے منزل تیری

نہ اتنا مل کہ یاروں کے لئے تو بار ہو جائے
نہ اتنا جا کہ تو اُن کے گلے کا ہار ہو جائے
کسی کی ہم سے اے یار و خوشامد ہو نہیں سکتی
کوئی ناراض ہوتا ہے اگر سَو بار ہو جائے
میں وہ تقدیر کا ہیٹا ہوں اس گلزارِ ہستی میں
کہ میرا ہاتھ لگ جانے سے گُل بھی خار ہو جائے
مری عرضِ تمنّا کا کوئی تو فیصلہ کر دو
اگر اقرار کر سکتے نہیں انکار ہو جائے
محبت وہ ہے جس سے رُوح کو تسکین ملتی ہو
محبت وہ نہیں جو جان کا آزار ہو جائے
بہ فیضِ حضرتِ پیرِ مغاں ممکن ہے یہ مضطرؔ
کہ دیوانہ بھی اپنے کام میں ہشیار ہو جائے

نہ پیام آیا نہ تم خود آئے
دل کو اب کیسے کوئی بہلائے
کس کو معلوم تھا ایسا ہوگا
اپنے انجام پہ ہم پچھتائے
جب کسی کی نہیں سنتا کوئی
کیسے اور کس کو کوئی سمجھائے
آسرا ہوتا ہے تیرا اُس وقت
کوئی اُمید نہ جب بر آئے
تو نے احوال کچھ ایسے پوچھا
اشک آنکھوں میں مری بھر آئے
دوست وہ دوست ہے تیرا دراصل
جو مصیبت میں ترے کام آئے
ہم سے خوبی بھی نہ چمکی اپنی
لوگ عیبوں کو بھی چمکا پائے
جانے کیا بات تھی مضطر صاحب
کل ہمیں آپ بہت یاد آئے

اے دل نہ غمِ عشق سے گھبرا تُو ذرا بھی
یہ عشقِ حقیقت ہیں مرض بھی ہے دوا بھی
مغرب سے اُٹھی دیکھ وہ گھنگھور گھٹا بھی
اے شیخ رَوا ہے تجھے اب پی بھی پلا بھی
دنیا کبھی ساری ہی بُری ہو نہیں سکتی
دیکھا ہے یہاں ہم نے تو اچھا بھی بُرا بھی
کچھ اپنی رضا سے بھی کیا جاتا ہے لیکن
کچھ دیکھنی پڑتی ہے زمانے کی ہوا بھی
مشتاق تری دید کا ہوں روزِ ازل سے
پردہ جو ترے رُخ پہ پڑا ہے وہ اُٹھا بھی
رہنے کا نہیں ایک سا احوال کسی کا
نغمہ ہے اگر آج تو کل آہ و بکا بھی
مرتا ہوں ترے حُسن کی ہر ایک ادا پر
دشمن ہے مری جان کی شوخی بھی حیا بھی
مضطرؔ ہے ازل سے یہی دستورِ زمانہ
ملنا ہے عزیزوں سے تو ہونا ہے جُدا بھی

بغور سُن لے تو مجھ سے یہ زندگی کا راز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

ہزار سادہ دلوں کا کیا ہے خون اُس نے
کہا ہے جس نے کہ ہوتا ہے حُسن عشق نواز

اگرچہ مجھ کو دکھائی تو کچھ نہیں دیتا
میں سُن رہا ہوں کہیں سے مگر تری آواز

تغیراتِ زمانہ سے مٹ گئے سب فرق
نہ غزنوی ہی رہا کوئی اور نہ کوئی ایاز

کسے بتاؤں میں درد اپنا کون حال سنے
کسے بتاؤں زمانے میں اپنا محرم راز

مجھے زمانے کے مکر و ریا ہیں سب معلوم
سمجھتا ہوں میں زمانے کا ایک ایک انداز

یہ دل کی بات تھی دل کا معاملہ تھا فقط
بلا ارادہ محبت کا ہو گیا آغاز

خیالِ خام ہے مفقط تری رسائی وہاں
حریمِ ناز کہاں اور کہاں تری پرواز

اِسی لئے مرا غم تجھ پہ آشکار نہیں
کہ آہ و زاری و نالہ مرا شعار نہیں
یہ لوگ آتے ہیں جو میری دلدہی کے لئے
میں جانتا ہوں کہ وہ میرے غمگسار نہیں
میں تجھ سے مہر و وفا کی اُمید کیا رکھوں
کہ اپنے جور و جفا پر تو شرمسار نہیں
اگرچہ فعل پہ اپنے ہے اختیار مجھے
مگر نتیجے پہ بالکل ہی اختیار نہیں
وفورِ شوق کی بے تابیاں ارے توبہ
ہوا ہے وعدہ تو اب تابِ انتظار نہیں
تعلقات کی دنیا غموں کی دنیا ہے
کوئی بھی سینہ نہیں غم سے جو فگار نہیں
غلط بیانیاں کرتے ہیں وقت کے حاکم
بڑے بڑوں کا بھی اب کوئی اعتبار نہیں

مُسکرا کر سامنے سے جب نکل جاتے ہیں آپ
آرزُوں کی سلگتی آگ بھڑکاتے ہیں آپ
حالِ دل کہنا نہیں جو بیں تو گھبراتا ہے جی
اَور جو کہتا ہوں حالِ دل تو گھبراتے ہیں آپ
چھوڑ دوں ہیں دل سے اُس ہستی کی محبت کا خیال
حضرتِ ناصح یہ کیا اور کس کو سمجھاتے ہیں آپ
بات ہے جِس مرحلے پر اُس پہ رہنے دیجئے
جتنی سلجھاتے ہیں اتنی اور اُلجھاتے ہیں آپ
ہم نہ کہتے تھے کہ پچھتانا پڑے گا آپ کو
فائدہ اب کیا جفا کر کے جو پچھتاتے ہیں آپ
میرے زخموں پر نمک پاشی نہیں تو کیا ہے یہ
کس لئے از یاد رفتہ قصّے دھراتے ہیں آپ
حضرتِ مضطر مسلّم پارسائی آپ کی
شام کو لیکن بلا ناغہ کہاں جاتے ہیں آپ

نہ بہلے گا مرا دل نغمہ ہائے شادمانی سے
اُسے تسکین ہوتی ہے فقط غم کی کہانی سے

مرا محبوب کوئی پیکرِ خاکی نہیں ہمدم
محبت ہے مجھے تو ایک حُورِ آسمانی سے

تم اپنے ہاتھ سے دو حرف لکھ دیتے پیامی کو
نہیں ہوتی تسلّی دل کی پیغامِ زبانی سے

حقیقت ہے یہ لیکن میں زباں پر لا نہیں سکتا
ہوئی ہے میری بربادی تمہاری مہربانی سے

خدا رکھے تجھے اے زخمِ دل کے بخشنے والے
مجھے تو یاد آ جاتا ہے اپنی اس نشانی سے

اسی میں مصلحت ہے ہم زباں جو بند رکھتے ہیں
غلط فہمی نہ ہو تم کو ہماری بے زبانی سے

الٰہی وہ بھی وقت آئے کہ پڑ رہئے کسی در پر
اٹھائے کوئی تو اٹھا نہ جائے ناتوانی سے

فقط شعر و سخن کو تو متاعِ زندگی سمجھا
نہیں تم نے لیا کچھ کام مضطرؔ زندگانی سے

مشکلیں دیکھی ہیں میں نے عمر بھر
مشکلوں سے اب میں گھبراتا نہیں

شیخ نے پی لی تو آخر کیا ہوا
دیکھ کر جی کس کا للچاتا نہیں

وقت ہے ہم پر کرو لطف و کرم
وقت گزرا ہاتھ پھر آتا نہیں

ہو گیا ہوں اس قدر مانوسِ غم
اب خیال اُن کا بھی تڑپاتا نہیں

رام ہو سکتی ہے دُنیا پیار سے
آزما لو جو یقیں آتا نہیں

دوستوں کو کیوں نہ ہو مجھ پر گلہ
میں کہیں آتا نہیں جاتا نہیں

یوں تو سب کچھ ٹھیک ہے مضطرؔ مگر
پھر بھی جینے کا مزا آتا نہیں

فروزاں میرے دل میں نورِ عرفاں ہو تو کیونکر ہو
میسر دولتِ دیدارِ جاناں ہو تو کیونکر ہو

مری کشتی سلامت آلگی ہے جب کنارے پر
مجھے پھر شکوۂ بیدادِ طوفاں ہو تو کیونکر ہو

تمہارے گیسو و رخسار پر دل جس کا قرباں ہے
اُسے احساسِ فرقِ کفر و ایماں ہو تو کیونکر ہو

نہ کہہ سکتا ہوں دردِ دل نہ سہہ سکتا ہوں دردِ دل
یہ پنہاں ہو تو کیونکر ہو نمایاں ہو تو کیونکر ہو

جب اُس کے جورِ بیجا کی شکایت ہی نہیں مجھ کو
وہ اپنے جورِ بے جا پر پشیماں ہو تو کیونکر ہو

کیا ہے جس نے دانستہ مجھے برباد اے مضطر
وہ بربادی پہ میری اب پشیماں ہو تو کیونکر ہو

لے اُڑا شوق مرا جانبِ رفعت مجھ کو
جب بھی ذرّوں سے ہے اب مہرسے اُلفت مجھ کو
ہو گئی ہے غمِ دنیا سے فراغت مجھ کو
مل گیا بے طلب انعامِ محبت مجھ کو
زندگی بھر رہے حاصل تری قربت مجھ کو
کوئی حسرت ہے تو ہے اک یہی حسرت مجھ کو
خود ہی لے آؤں گا ایمان میں تجھ پر واعظ
جب نظر آئے گی کچھ تجھ میں صداقت مجھ کو
مجھ کو ترغیب گناہ دیتے رہے جو کل تک
آج کرتے ہیں وہی لوگ نصیحت مجھ کو
مل گئے تم تو میں ہو گیا دُور اپنے سے
تم سے مل کر بھی رہی ملنے کی حسرت مجھ کو
اس ستم کیش نے اب ہاتھ ستم سے کھینچا
جب ذرا آنے لگی درد میں لذّت مجھ کو
جس نے دے رکھے ہیں غم مجھ کو زمانے بھر کے
غم اٹھانیکے بھی دیدیگا وہ طاقت مجھ کو
میں پرستار ہوں ہر اہلِ صفا کا مضطر
ہر ریاکار سے لاریب ہے نفرت مجھ کو

باقی جو رہ گئے تھے محبت کے داغ سے
اب جل رہے ہیں سینے میں بن کر چراغ سے
پھیلی ہمارے دم سے محبت کی روشنی
صدہا جلے چراغ ہمارے چراغ سے
یہ لوگ کیوں سمجھتے ہیں تجھ سے مجھے الگ
میرا سراغ ملتا ہے تیرے سراغ سے
ہرگز نہیں فضیلتِ دُنیا کا اہل تو
آتی ہے بُو غرور کی تیرے دماغ سے
پھولوں میں اب نہ رنگ کہیں ہے نہ بُو کہیں
یہ کون رشکِ باغ گیا آکے باغ سے
باغِ سخن کی سیر ہے مضطرؔ مرا اشعار
چُنتا ہوں روز پھول میں گلزارِ داغ سے

اثر کرتی نہیں دل پر ہنسی کوئی خوشی کوئی
نظر آتا نہیں اب چارۂ افسردگی کوئی
مقابل سے وہ یوں گزرے کہ جیسے اجنبی کوئی
مرے دل میں خیال آیا کبھی کوئی کبھی کوئی
نفس کو جیت اگر ہے دعوائے مردانگی تجھ کو
جہاں کو جیت لینا تو نہیں مردانگی کوئی
توقع عیش و راحت کی ہمیں غربت میں کیا ہوتی
وطن میں بھی نہ جب پائی کبھی آسودگی کوئی
مرے چاروں طرف اب نا اُمیدی کا اندھیرا ہے
نظر آتی نہیں جس میں کرن اُمید کی کوئی
محبت میں جگر کا خون آنکھوں سے بہانا ہے
حماقت ہے محبت کو جو سمجھے دل لگی کوئی
تجھے اُس در سے منہ مانگی مرادیں ہو گئیں حاصل
لگا ہے آج اے مضطر ترے ماتھے سخی کوئی

جس کی کوئی مثال نہ جس کا جواب ہے
تُو آسمانِ حسن کا وہ آفتاب ہے
جب سے وہ رشکِ شمس و قمر بے نقاب ہے
میری نظر ہی میرے لئے اک حجاب ہے
ممتاز تیری بزم میں ہے ہر دروغ باف
جو حق سرا ہے موردِ قہر و عذاب ہے
کرتا ہے راہِ شوق میں جو کوششِ تمام
ناکامیاب بھی ہے تو وہ کامیاب ہے
میں جی رہا ہوں پھر بھی بڑے اہتمام سے
جینا اگرچہ میرے لئے اِک عذاب ہے
اُس اِک نگاہ سے مری دنیا بدل گئی
یہ لاکھ انقلاب کا اِک انقلاب ہے
کیا پوچھتے ہو شان دیارِ حبیب کی
ہر ذرہ اس دیار کا اک آفتاب ہے
مضطرؔ تو اپنا نامۂ اعمال صاف رکھ
نیکی بدی کا ایک دن آخر حساب ہے

احساس میرے درد کا تم کو ذرا نہیں
بے درد کوئی تم سا جہاں میں ہوا نہیں
یہ تو نہیں کہ میرا کوئی مدعا نہیں
کھُلتا ترے حضور لبِ التجا نہیں
پتہ بھی ہِل سکا نہ ترے حکم کے بغیر
دانشورانِ دہر نے کیا سمجھ کیا نہیں
چوری چھپے بھی تو جو کرے دیکھتا ہے وہ
یہ مت سمجھ کہ کوئی تجھے دیکھتا نہیں
دَیر و حرم کی سرحدوں سے پار ہو کے دیکھ
وہ کونسی جگہ ہے جہاں پر خدا نہیں
ناز و ادا و غمزہ تجھے سب روا سہی
لیکن یہ بے رُخی تری مجھ سے روا نہیں
یوں زندگی گزار رہا ہوں عذاب میں
جیسے کہ مجھ غریب کا کوئی خدا نہیں
یہ دوستوں کی رائے ہے مضطر کے باب میں
قسمت بُری ہے اُس کی مگر خود بُرا نہیں

دل سے ترا خیال ابھی تک گیا نہیں
قربت کا تیری عہد مجھے بھولتا نہیں
اس سے بھی بڑھ کے اور وہ دینگے مجھے سزا
ترکِ تعلقات ہی پر اکتفا نہیں
زاہد تری عبادتِ بے کیف و بے اثر
بیکار ہے تو غم سے اگر آشنا نہیں
اکثر بُرے ہی پھولتے پھلتے ہیں آج کل
یہ دور وہ ہے جس میں بھلے کا بھلا نہیں
الزام دوسروں پہ لگاتے ہیں ہم مگر
اپنا قصور آپ کوئی مانتا نہیں
نا اہل انجمن میں تری سرفراز ہیں
اہلِ ہنر کو کوئی یہاں پوچھتا نہیں
حیران ہو رہا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
مجھ کو وفورِ یاس میں کچھ سوجھتا نہیں
مضطر ذرا سنبھل کے چلو راہِ عشق میں
اس راہ میں جو گر گیا وہ پھر اُٹھا نہیں

اے مقصدِ حیات کبھی آشکار ہو
قلب و نظر کے واسطے وجہِ قرار ہو
مَے ہی اگر علاجِ غمِ روزگار ہو
کیوں کر نہ پھر ایک بشر مَے گسار ہو
آتا ہے وہ فریب میں دنیا نہ دین کے
دیوانہ اپنے کام میں جو ہوشیار ہو
اُس دل کے اضطراب کا عالم نہ پوچھئے
جس بد نصیب دل کو ترا انتظار ہو
اس کے لئے حیات بھی مشکل ہے موت بھی
جس کی حیات و موت کا تم پر مدار ہو
مضطر مجھے اماں چمنِ دہر میں کہاں
دشمن ہے میری جان کا گل ہو کہ خار ہو

یارب نہ یوں کسی کی تپاں جانِ زار ہو
دن کو سکون آئے نہ شب کو قرار ہو
حرفِ گلہ نہ لاؤں گا اپنی زباں پہ میں
تو بھی تو اپنے دل میں ذرا شرمسار ہو
مجھ کو طلب ہے رحمتِ پروردگار کی
بگڑی بنے جو رحمتِ پروردگار ہو
ناصح جو تجھ کو کہنا تھا اک بار کہہ لیا
اس بات میں اثر نہیں جو بار بار ہو
میری زباں پہ شام و سحر تیرے گیت ہوں
تیرے قصیدہ خوانوں میں میرا شمار ہو
مضطر جو دیکھتا ہے مجھے پوچھتا ہے یہ
تم بھی کسی کے تیرِ نظر کا شکار ہو

ہمارے دوستوں کو کاش کوئی اتنا سمجھاوے
ہمارا کچھ کسی کی دشمنی سے ہو نہیں سکتا
جہانِ عشق میں کیوں کر نہ ہو توقیرِ پروانہ
رعنا کارانہ جلنا ہر کسی سے ہو نہیں سکتا
بشر کو زندگی میں کام تو کرنا ہی پڑتا ہے
کوئی بھی کام لیکن بے دلی سے ہو نہیں سکتا
شعارِ دوستی سے دے جوابِ دشمنیِ ناداں
مداوا دشمنی کا دشمنی سے ہو نہیں سکتا
خلوص و صدق سے عاری ہے تیری بندگی زاہد
خدا راضی نرِی اس بندگی سے ہو نہیں سکتا
یہ مانا مر کے چھُٹ سکتے ہیں رنج و غم کے جینے سے
مگر مرنا بھی تو اپنی خوشی سے ہو نہیں سکتا
مصیبت آنیوالی ہے جو کل اس کیلئے مضطر
ہیں وقفِ رنج و فکر و غم ابھی سے ہو نہیں سکتا

اُٹھائے رنج کھایا غم پیا اکثر لہو میں نے
مگر رکھی بچا کر زندگی کی آبرو میں نے
مرے انداز وحشت ساری دنیا سے نرالے ہیں
گریباں چاک کرکے خود کیا اکثر رفو میں نے
نقوشِ نرم و نازک آج بھی کچھ دل پہ باقی ہیں
بہت مدت ہوئی چھوڑا جہانِ رنگ و بو میں نے
مجھے افسوس ہے تجھ کو نہیں قدر وفا کچھ بھی
پسینے کی جگہ تیرے بہایا ہے لہو میں نے
بڑی دلچسپ راہوں سے گزرتا جا رہا ہوں میں
بنایا جب سے نصب العین اپنا جستجو میں نے
یہ ساری نعمتیں دنیا کی مل سکتی ہیں مجھ کو بھی
مگر رکھی نہیں دل میں کبھی یہ آرزو میں نے
ذرا سی بات پر آپے سے ہو جاتا ہے باہر تو
کوئی تجھ سا نہیں دیکھا جہاں میں تند خو میں نے
بہت پامال تھا حسن و محبت کا بیاں مضطرؔ
بدل ڈالا ہے اس مضمون پہ طرزِ گفتگو میں نے

دلِ ناداں یہ محبّت میں شکایت کیسی
خود سہیڑی جو مصیبت وہ مصیبت کیسی

تجھ کو معلوم ہو کیا دردِ غریبی کیا ہے
تُو نے دیکھی ہی نہیں ہوتی ہے عُسرت کیسی

رات کی رات تو رہ جاؤ اگر آئے ہو
جانِ من آتے ہی جانے کی اجازت کیسی

ایک میلہ سا لگا رہتا ہے اُن کے در پر
حُسن والوں کو خدا دیتا ہے شہرت کیسی

کون سمجھائے تمہیں حرص و ہوا کے بندو
عشق کیا چیز ہے ہوتی ہے محبت کیسی

تجھ کو بھی مرنا ہے اک روز تجھے یاد رہے
مرگِ دشمن پہ مری جان مسرّت کیسی

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں جو اے مضطر
وہ یہ کیا جانیں کہ حرکت میں ہے برکت کیسی

جلوے کی اک جھلک کبھی ہمت ہو مرے لئے
گوشہ ذرا سا رُخ سے اُلٹ دو نقاب کا

واعظ ابھی تو میری جوانی کی عمر ہے
کیوں کر کروں خیال میں روزِ حساب کا

آنکھوں میں ہے سرور تو چہرے پہ نور ہے
کتنا ہے دلفریب یہ عالم شباب کا

اس نامرادِ عشق کے ہاتھوں میں کیا کہوں
جینا ہے میرے واسطے جینا عذاب کا

دیکھا تھا بزمِ غیر میں کل میں نے آپ کو
لیکن نہ تھا وہ وقت سوال و جواب کا

اُس نوبہارِ حُسن کے ہونٹوں کی تازگی
ایسی ہے جیسے پھول کھلا ہو گلاب کا

رہتی ہے مجھ پہ چشمِ کرم ان کی آج کل
آغاز ہے مگر یہ کسی انقلاب کا

دنیا میں کچھ کمی نہیں حُسن و جمال کی
لے مضطر امتحاں ہے ترے انتخاب کا

ترس رہا ہوں میں کب سے تمہارے آنے کو
کبھی تو بخش دو رونق غریب خانے کو
کمی نہیں کسی شئے کی ترے زمانے میں
کہ خون پینے کو ہے اور غم ہے کھانے کو
ٹھکانہ اور نہیں کوئی تیرے در کے سوا
کہاں میں چھوڑ کے جاؤں اس آستانے کو
ہے ایک تلخ حقیقت مرے فسانے میں
زمانہ کیسے سنے گا مرے فسانے کو
مجھے تو کر دیا خاموش تم نے اے ظالم
خموش کیسے کرو گے مگر زمانے کو
متاع دردِ محبت بہت بڑی شئے ہے
لگا کے رکھو کلیجے سے اس خزانے کو
تجھی کو آپ بدلنا پڑے گا اے مضطر
بدل سکے گا نہ زنہار تو زمانے کو

غم نہیں حاصل مجھے جو دولتِ دُنیا نہیں
لکھنے والے ہی نے یہ تقدیر میں لکھا نہیں

ایکہ تُو دِن رات کہتا ہے کہ لوگ اچھے نہیں
لوگ تو اچھے ہیں لیکن تُو ہی خود اچھا نہیں

ہم نے مانا اب زمیں سونا اگلتی ہے مگر
حصۂ دہقاں ابھی دہقان کو پہنچا نہیں

تیری محفل میں نہیں شاہ و گدا کا امتیاز
تیری محفل میں کوئی اعلیٰ نہیں ادنیٰ نہیں

عقل کا اندھا ہے یا پتلا تعصب کا ہے وہ
ملک پھلتا پھولتا جس کو نظر آتا نہیں

یا ترے لطف و کرم کا بھی مجھے شکوہ رہا
یا ترے جور و ستم کا بھی مجھے شکوہ نہیں

کام کرنے کو بہت ہے زندگی تیرے لئے
تو اگر سمجھے تو یہ عرصہ کوئی تھوڑا نہیں

آدمی بنتا ہے مضطرؔ ٹھوکریں کھا چکے بعد
ٹھوکریں جبتک نہ کھائے آدمی بنتا نہیں

حضور اُن کے ہماری زباں کھُلی نہ کبھی
جو بات کرنی تھی ہم نے وہ بات کی نہ کبھی
بشر کو چاہیئے چلتا رہے کہیں نہ رُکے
پہنچ ہی جائے گا منزل پہ بھی کبھی نہ کبھی
یہ آگ عشق و محبت کی ہے سُلگتی رہی
جو ایک بار لگی دل میں پھر بجُھی نہ کبھی
وہ رُوبرو جو نہ آئے تو بھی نظر بے تاب
وہ رُوبرو جو ہوئے تو نظر اٹھی نہ کبھی
جو زندگی کے حقائق کی کچھ خبر ہوتی
قبول ہوتی کسی کو یہ زندگی نہ کبھی
تغیراتِ زمانہ سے کوئی بچ نہ سکا
رہی کسی کی زمانے میں ایک سی نہ کبھی
جو اپنے بندوں کا حاجت روا نہ ہو مضطرؔ
کروں گا ایسے خدا کی میں بندگی نہ کبھی

وہ پہلے سے بھی بڑھ کر سرگراں ہے
مرا شاید کوئی اور امتحاں ہے
ہمیں رکھتا ہے جو محرومِ جلوہ
کوئی پردہ ہمارے درمیاں ہے
تجھے میں رنگ و بو میں ڈھونڈتا ہوں
مجھے آواز تو دے تو کہاں ہے
یہ دنیا بھی ہے اک طرفہ تماشا
کوئی ناشاد کوئی شادماں ہے
کسی پر حالِ دل کیوں کر عیاں ہو
زباں کا دل نہیں دل بے زباں ہے
جو چاہو سو کرو ہے راج اپنا
زمیں اپنی ہے اپنا آسماں ہے
وہی تو ہے وہی ہے اعتنائی
وہی میں ہوں وہی آہ و فغاں ہے
یہ کیا خوش فہمیاں ہیں تیری مضطر
جفاؤں پر وفاؤں کا گماں ہے

ہمیں اُٹھا کے تری انجمن جمی نہ رہی
ہمارے بعد تری بات وہ بنی نہ رہی

تمام عمر تو ملنے سے اجتناب کیا
وہ جب ملے ہیں کہ ملنے کی جب خوشی نہ رہی

زمانہ میری نگاہوں میں ہوگیا تاریک
ترے بغیر زمانے میں روشنی نہ رہی

کمی یہ ساری تھی تیرے کرم کے ہونے تک
کرم جو تیرا ہوا تو کوئی کمی نہ رہی

چمن کو کر دیا بادِ سموم نے تاراج
جو تازگی گل و شاخ و شجر میں تھی نہ رہی

تمہارے جور و ستم میں کوئی کمی نہ رہے
ہماری جان کا کیا ہے رہی رہی نہ رہی

وہ لوگ کیسے ہیں جو صاف دل نہیں مضطر
ہمیں کسی سے کدورت کوئی کبھی نہ رہی

زندگانی ہے تیز گام بہت
وقت تھوڑا ہے اور کام بہت
تیرے وعدے نئے نہیں کوئی
ہم نے دیکھے ہیں صبح و شام بہت
کچھ نہ کچھ کام تبھی تو کر جاؤ
تم اگر چاہتے ہو نام بہت
شیخ صاحب کا بادہ خانے میں
رند کرتے ہیں احترام بہت
وہ بغل میں چھری بھی رکھتے ہیں
جن کے منہ میں ہے رام رام بہت
بارِ عالم کو گھوم پھر کر دیکھ
اک جگہ پر نہ کر قیام بہت
تجھ کو کیوں کر وصال ہو مضطرؔ
تو ابھی عشق میں ہے خام بہت

نہیں کچھ فیض جس سے وہ بشر کیا
نہ ہو سایہ ہی جس کا وہ شجر کیا
نظر آتے ہیں عیب اوروں کے تجھ کو
کبھی اپنے بھی عیب آئے نظر کیا
قدم کیوں رک گئے وقتِ رواں کے
نہیں ہوگی شبِ غم کی سحر کیا
نہیں دیر و حرم میں فرق کوئی
چلے جاؤ ادھر کیا اور اُدھر کیا
محبت تو ہے سودا دل کا اس میں
خیالِ نفع کیا فکرِ ضرر کیا
پڑا رہ ایک ہی در پر ہمیشہ
بھٹکتا پھر رہا ہے در بدر کیا
نہ کر فریادِ مضطر اس کے آگے
وہ بت ہے سنگ دل اس پر اثر کیا

حق گوئی سے تُو باز نہ آ کوئی کچھ کہے
سب کو کھری کھری ہی سنا کوئی کچھ کہے
یہ نکتہ چیں تو جلتے ہیں تیرے کمال سے
تُو دل پہ کوئی بات نہ لا کوئی کچھ کہے
اپنی روش ہے اور چلا جا رہا ہوں میں
پروا نہیں بھلا یا بُرا کوئی کچھ کہے
ہوگی نہ میرے جذبِ محبت میں کچھ کمی
ہو کر رہے گی قدرِ وفا کوئی کچھ کہے
وہ عرضِ غم کی دیں بھی اجازت تو فائدہ
جب کہہ ہی کچھ سکے نہ تو کیا کوئی کچھ کہے
مضطر کو کیوں نہ یاد کریں دوست رات دن
لاکھوں میں بھی وہ ایک ہی تھا کوئی کچھ کہے

ہوش سے بیگانہ ہے تو جوش ننگ جوش ہے
جوش سے بیگانہ ہے تو ہوش ننگِ ہوش ہے
منتظر کب سے ہیں تیرے اے صبا اہلِ چمن
پھول کی ہر پنکھڑی تیرے لئے آغوش ہے
چین دنیا میں کہیں جن کے نصیبوں میں نہیں
اُن غریبوں کے لئے وا موت کی آغوش ہے
کس طرح دنیا و مافیہا نظر آئے اُسے
اپنی طاقت کے نشے میں جو بشر مدہوش ہے
شور و شر شیوہ انہی کا ہے جو کچھ کرتے نہیں
کام کرنے میں جو ہے مصروف وہ خاموش ہے
شعر کہنے کو فراغت ہے نہ وہ فرصت ہی اب
پھر عجب کیا ہے جو مضطرؔ آج کل خاموش ہے

حُسن کی رعنائیاں تو آج بھی ہیں دلفریب
لیکن اپنے دل کا اب اگلا سا وہ عالم نہیں
محفلِ عشرت مبارک ہو تمہی کو دوستو
شامل اس محفل میں ہو جانیکے قابل ہم نہیں
ہر کسی سے حالِ دل اپنا کہا جاتا نہیں
حالِ دل کس سے کہوں کوئی مرا محرم نہیں
اور کچھ تدبیر کر اظہارِ غم کی اے جنوں
جیب و دامن چاک کرنے کا ابھی موسم نہیں
منزلِ آدم تو ہے معراج پانا عشق کی
چاند تاروں تک پہنچنا منزلِ آدم نہیں
پوچھ لیتے ہو کبھی تم اپنے دیوانوں کا حال
یہ مروّت بھی ہمارے واسطے کچھ کم نہیں
شاید اس سے بیخبر ہے تو کہ اب تیرے سوا
میرے زخمِ دل کی دنیا میں کوئی مرہم نہیں
پوچھ کر ہر ایک سے تم دیکھ لو مضطر بیاں
کوئی بھی ایسا نہیں جو مبتلائے غم نہیں

پیامِ محبت سُنا ہر کسی کو
محبت کا رستہ دکھا ہر کسی کو
محبت سے کر زیر سارا زمانہ
محبت سے اپنا بنا ہر کسی کو
مذاق ایسا بگڑا ہے اہلِ جہاں کا
ہے اچھا بھی لگتا بُرا ہر کسی کو
شہنشہ ہو کوئی کہ کوئی گدا ہو
ہے اِک روز ہونا فنا ہر کسی کو
وہ پتھر کے کیڑے کو بھی دے رہا ہے
جو دیتا ہے روزی خدا ہر کسی کو
دئیے اور دیئے تُو نے بھر بھر کے ساغر
مگر ایک میرے سوا ہر کسی کو
فقط ایک نیت ہی سُنتے ہیں اس کو
نہیں دل کی آتی صدا ہر کسی کو
خدا کی یہ حکمت کہ اس نے بنایا
جدا ہر کسی سے جدا ہر کسی کو
مبارک ہو مضطر تجھے قربِ جاناں
نہیں ملتا یہ مرتبہ ہر کسی کو

نہ چھیڑ اے ہم نشیں قصّے پُرانے
نہیں وہ دن نہیں اب وہ زمانے
کسی شے کی مجھے حاجت ہوئی جب
رَوا کر دی مرے حاجت رَوا نے
بھروسہ ہے مجھے اُس کے کرم پر
بڑے معمور ہیں جس کے خزانے
بڑے ثابت قدم جو تھے انہیں بھی
بدل ڈالا زمانے کی ہوا نے
کبھی دیکھے چمن میں پھول کھلتے
کبھی دیکھے ہیں جلتے آشیانے
گُلوں کو رنگ و بُو نے دلکشی دی
گلستاں کی بہارِ دل کشا نے
تم آجاتے تو اک احسان ہوتا
نہ آنے کے تو ہیں لاکھوں بہانے
ترا یہ فرضِ انسانی ہے ہمدم
تو نیکی کر کوئی جانے نہ جانے
نہیں ملنے کا موقعہ آج مضطر
ملیں گے پھر اگر چاہا خدا نے

یہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں
کہ وہ چل پڑے ہیں ابھی آ رہے ہیں
ستم سہہ رہے ہیں ستم سہنے والے
ستم ڈھانے والے ستم ڈھا رہے ہیں
انوکھی ہیں میرے چمن کی بہاریں
کہ غنچے بہاروں میں مرجھا رہے ہیں
کبھی ناز تھا جن کو تیغِ جفا پر
اب اپنے کئے پر وہ پچھتا رہے ہیں
تکلّم میں جھڑتے ہیں موتی زباں سے
تبسّم سے وہ پھول برسا رہے ہیں
محبّت سے کب باز آتا ہے کوئی
مرے دوست کیوں مجھ کو سمجھا رہے ہیں
رہِ شوق پر چلنا مشکل ہے مضطرؔ
مگر چلنے والے چلے جا رہے ہیں

کھویا گیا ہوں راہِ وفا میں کچھ اسطرح
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
کیا دے سکے گا کوئی فریبِ نظر مجھے
پہچانتا ہوں خوب ہر اک کی نظر کو میں
پھوٹے گی یاس سے بھی کوئی آس کی کرن
تاریک شب میں ڈھونڈ رہا ہوں سحر کو میں
رہ رہ کے یاد آتی ہیں باتیں نئی نئی
اِک اِک قدم پہ روکتا ہوں نامہ بر کو میں
تجھ سے پھر ایک تیرِ نظر کی ہے آرزو
پاتا ہوں آج درد سے خالی جگر کو میں
اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
تکتا ہوں صبح و شام تری راہگزر کو میں
مضطرؔ یہ بات قدرِ ہنر کے خلاف ہے
مُنہ کس طرح لگاؤں کسی بے ہنر کو میں

میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ہیں اسی کے بندے
میری نظروں میں ہے کافر نہ مسلماں کوئی

قسمت ہر کس و ناکس نہیں اندازِ جنوں
دیکھنا دیکھی نہ کرے چاکِ گریباں کوئی

کرنے والوں نے محبت میں بڑے کام کئے
تجھ سے اے دل نہ ہوا کارِ نمایاں کوئی

آپ آؤ نہ کبھی تم نہ بلاؤ مجھ کو
یہ محبت بھی محبت ہے مری جاں کوئی

یہ فسوں تیری دو رنگی کا نہیں تو کیا ہے
کوئی خنداں ہے تری بزم میں گریاں کوئی

شکر کرتا ہوں بصد صدق خدا کا مضطر
باوجودیکہ نہ نکلا مرا ارماں کوئی

رواں دواں ہے زمانہ جو نیرگی کی طرف
پلٹ کے آئے گا اک روز روشنی کی طرف

بگڑ گئی تو یہاں تک بگڑ گئی اُن سے
پھر ایک بار بھی دیکھا نہ اُس گلی کی طرف

ابھی تو مستی و رندی کا ہے جنون سوار
طبیعت آتے ہی آئے گی بندگی کی طرف

بڑی خراب ہے شکّی مزاج ہے دُنیا
نظر اُٹھا کے نہ دیکھے کوئی کسی کی طرف

یہ اور بات ہے نیکی اگر وہ کرتا ہے
بشر کا ویسے تو میلان ہے بدی کی طرف

غریب خانے پہ تشریف لے تو آئے وہ
مگر لگی رہی اُن کی نظر گھڑی کی طرف

شعار اُس کا وفا دشمنی ہے اے مضطر
محال ہے کہ وہ مائل ہو دوستی کی طرف

جب دل ہی تھا وسیع تو دنیا بھی تھی وسیع
جب دل ہی تنگ ہو گیا دنیا سکڑ گئی
شرم و حیا جہاں میں کہیں نام کو نہیں
اب کچھ ہوا زمانے کی ایسی بگڑ گئی
تم سے جو بن گئی تو جہاں سے بھی بن گئی
تم سے بگڑ گئی تو جہاں سے بگڑ گئی
حد سے زیادہ ہو گیا برہم وہ تند خو
اظہارِ غم پہ جان مصیبت میں پڑ گئی
اب دل کی آرزوؤں کا ماتم ہے اور میں
برسوں میں جو بسائی تھی بستی اُجڑ گئی
کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہو آجکل
مضطر یہ کیا ہوا یہ کہاں آنکھ لڑ گئی

بلائے جاں تمہاری ہر ادا ہے
مگر دل کش بحدِّ انتہا ہے
شناسا تو کسی کا کب ہوا ہے
عدو بھی آج میرا ہم نوا ہے
عبادت میرا ذاتی مسئلہ ہے
کسی کو کیا وہ بُت ہے یا خدا ہے
بُرائی کا نتیجہ ہے بُرائی
بھلے ہی کا یہاں آخر بھلا ہے
یہ مانا ایک ہی منزل ہے سب کی
مگر ہر ایک کا رستہ جُدا ہے
نہ کر طاقت پہ ظالم ناز اتنا
کبھی طاقت سے بھی کوئی دبا ہے
نہ ڈر تو ہے جو بے یار و مدد گار
نہیں جن کا کوئی ان کا خدا ہے
تھا جس مضطرؔ کی خودداری کا شہرہ
وہ اب در در بھٹکتا پھر رہا ہے

مجھ کو مرغوب نہیں مکر و ریا کا بندہ
اُس کا بندہ ہوں جو ہو صدق و صفا کا بندہ

اے بتو میں نے خدا مان کے پوجا ہے تمہیں
مجھ سا پاؤ گے نہ تم کوئی خدا کا بندہ

میں نے بے سُود رکھی اُس سے وفا کی اُمید
باز آیا نہ جفا سے وہ جفا کا بندہ

جو بھی ارشاد ہو صاحب بسر و چشم قبول
عشق کا بندہ ہے تسلیم و رضا کا بندہ

ناصحا ترکِ وفا کی مجھے تلقین نہ کر
میرا شیوہ ہے وفا میں ہوں وفا کا بندہ

ایک عالم کے دلوں پر ہے حکومت تیری
ایک عالم ہے تیرے ناز و ادا کا بندہ

میں نے پایا ہے تجھے صابر و قانع مضطرؔ
میں نے سمجھا تھا تجھے حرص و ہوا کا بندہ

تجھ سے چشمِ وفا ہے بے معنی
میری آہ و بکا ہے بے معنی
تیرے عہدِ وفا پہ کیا جائیں
تیرا عہدِ وفا ہے بے معنی
اپنے کچھ ہم زباں کبھی پیدا کر
کہ اکیلی صدا ہے بے معنی
تیرے جور و جفا کا ہوں عادی
مجھ پہ تیری جفا ہے بے معنی
مجھ بلا نوش کے لئے واعظ
خوفِ روزِ جزا ہے بے معنی
اُس جفا کیش تند خُو کے حضور
میرا ذکرِ وفا ہے بے معنی
ہر بقا ہے یہاں فنا انجام
آرزوئے بقا ہے بے معنی
دل سے نکلے تو ہو دُعا میں اثر
یہ نہیں تو دعا ہے بے معنی
وہ تو عادت سے اپنی ہے مجبور
مضطرؔ اُس کا گلہ ہے بے معنی

دلنشیں ہیں یہ تری شوخ ادائیں کیا کیا
دلِ مشتاق نے لیں تیری بلائیں کیا کیا
سہنی پڑتی ہیں محبت میں سزائیں کیا کیا
ہم سے ہو جاتی ہیں بے قصد خطائیں کیا کیا
ہم پہ رکھی ہیں روا تو نے جفائیں کیا کیا
داغِ دل، زخمِ جگر تجھ کو دکھائیں کیا کیا
لوگ کرتے ہیں ترے باب میں کیا کیا باتیں
تجھ کو اے بانیِ بیداد سنائیں کیا کیا
تجھ کو اللہ کرے دولت دنیا ہو نصیب
ہیں نے مانگی ہیں ترے حق میں دعائیں کیا کیا
جام پر جام لنڈھانے چلو اے مے خوارو
جھوم کر اٹھی ہیں گھنگھور گھٹائیں کیا کیا
بام پر جب وہ کبھی پیکرِ انوار آیا
جگمگا اٹھی ہیں جلووں سے فضائیں کیا کیا
محفلِ شعر میں انداز غزل خوانی سے
باندھی ہیں حضرتِ مضطر نے ہوائیں کیا کیا

کچھ اور اگر نہ تو مرے پروردگار دے
مجھ بے نوا کو طبعِ قناعت شعار دے
جھوٹی تسلّیوں سے اب اُکتا گیا ہوں میں
جھوٹی تسلّیاں نہ مجھے بار بار دے
آؤں نہ بار بار ترے در پہ کس طرح
جب گھر میں بیٹھنے نہ دلِ بے قرار دے
میں بھی کبھی نکال سکوں دل کی حسرتیں
توفیق اتنی اے مرے پروردگار دے
تیرے بغیر آئے مزا کیا بہار کا
تو بھی جو ساتھ ہو تو مزا پھر بہار دے
قسمت میں ہر کسی کی نہیں دردِ عاشقی
یہ دین جس کو رحمتِ پروردگار دے
ہرگز نہ باز آئیں گے کہنے سے حق کی بات
گردن بھی چاہے کوئی ہماری اُتار دے
مضطرؔ مسرّتوں کے کبھی دن آئیں گے ضرور
یہ دن مصیبتوں کے خوشی سے گزار دے

یا الٰہی یہ کیسا آیا وقت
کہ نہیں کٹا ٹنے سے کٹتا وقت

جان پر اک عذاب ہے دن رات
ہم نے دیکھا کبھی نہ ایسا وقت

وقت کی قدر کر ارے ناداں
ہاتھ آتا نہیں جو گزرا وقت

جو بھی چاہو کرو ستم ہم پر
آج ہے خیر سے تمہارا وقت

وقت کا حکم کون ٹال سکا
سب کو جانا پڑا جب آیا وقت

ہنسنے والے ہنسا کئے دن رات
رونے والوں نے رو رو کاٹا وقت

کوئی پُرسانِ حال ہو کہ نہ ہو
کٹ ہی جاتا ہے غمزدوں کا وقت

ہو گا نظمِ جہاں تہہ و بالا
آنے والا ہے ایک ایسا وقت

اگلے وقتوں کے لوگ ہم ٹھہرے
مضطر اب یہ نہیں ہمارا وقت

جمع کرکے سیم و زر لعل و گہر جاتا رہا
جو یہاں آیا وہ سب کچھ چھوڑ کر جاتا رہا
ایک ہی جلوے میں تسکینِ تمنا ہو گئی
دید کی حسرت گئی ذوقِ نظر جاتا رہا
رات کاٹی اس طرح سے انتظارِ یار میں
صبح تک میں بڑبڑاتا سوئے در جاتا رہا
زور و زر تھا پاس تو تھے یار میرے اردگرد
یار بھی جاتے رہے جب زور و زر جاتا رہا
نقشِ دل میں تلخ یادیں آج تک اُس وقت کی
بارہا دل پر جو آیا اور گزر جاتا رہا
دیکھ لینا تم جہاں زیر و زبر ہو جائیگا
جب جہاں سے امتیازِ خیر و شر جاتا رہا
منتظر اُن کے ہر بلاوے پر وفورِ شوق سے
اُڑتا اُڑتا میں ہوا سے بیشتر جاتا رہا

تابِ جلوۂ دمِ دیدار نہ لائیں آنکھیں
ایک پل کبھی نہ اُنہیں دیکھنے پائیں آنکھیں
میرے رستے میں بکھیرے ہیں اُسی نے کانٹے
میں نے جس شوخ کی راہوں میں بچھائیں آنکھیں
ناز و انداز سے دل لے لیا میرا پہلے
اُس ستمگار نے پھر مجھ کو دکھائیں آنکھیں
اک ترا دل ہے نہیں جس پہ اثر کچھ، ورنہ
میری فریاد پہ کس کی نہ بھر آئیں آنکھیں
داخل اس شان سے جنت میں ہوا تیرا شہید
خیر مقدم کو فرشتوں نے بچھائیں آنکھیں
کردیا تم ہی نے خود رازِ محبت افشا
کس لئے مجھ سے سرِ بزم چرائیں آنکھیں
مجھ سے مطلب تھا تو آنکھوں پہ بٹھایا مجھ کو
مجھ سے مطلب نہ رہا جب تو دکھائیں آنکھیں
میرے شکوؤں پہ ہوئے پہلے تو وہ کچھ برہم
پھر ندامت سے نہ تا دیر اٹھائیں آنکھیں
دل سے دل اُس نے ملایا نہ اگر اے منتظر
یہ بھی کیا کم ہے کہ آنکھوں سے ملائیں آنکھیں

آپ نے مجھ سے گو چھپائی بات
میرے لب پر مگر نہ آئی بات
میرے منہ سے نہ کچھ سنو جبتک
تم نہ مانو سنی سنائی بات
حرفِ مطلب میں ان سے کہہ بیٹھا
مفت بگڑی بنی بنائی بات
جانے کیا بات تھی کہ ان کے حضور
دل سے نکلی نہ لب تک آئی بات
بات کر کے بھی اُن سے دیکھ لیا
منہ سے کہہ کر عبث گنوائی بات
آپ کی بات کون ٹال سکا
آپ کی بات ہے خدائی بات
رازِ دل مت کسی سے کہہ مضطر
منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

اب نہ عشقِ بتاں کرے کوئی
یوں نہ جی کا زیاں کرے کوئی

محرمِ راز کوئی پیدا ہو
رازِ عالم عیاں کرے کوئی

دل کی باتیں نہ جب سُنے کوئی
دل کی باتیں کہاں کرے کوئی

زندگی جو ہے گوہرِ نایاب
کیوں اُسے رائیگاں کرے کوئی

شرح و تفسیرِ عشق ! ناممکن
جتنا چاہے بیاں کرے کوئی

جب کسی کو یہاں قیام نہیں
کیوں غمِ رفتگاں کرے کوئی

جان دینے میں کیا تامل ہے
جان لینے کی ہاں کرے کوئی

جب نتیجہ ہی کچھ نہ ہو مضطر
کیوں پھر آہ و فغاں کرے کوئی

میں اپنے آپ میں گم ہو گیا ہوں
سُکڑتا اور سمٹتا جا رہا ہوں
مدارج ہیں یہ میری بندگی کے
میں انساں ہوں، فرشتہ ہوں، خدا ہوں
ستاتی ہے مجھے جب تنگ دستی
تو ہاتھوں کی لکیریں دیکھتا ہوں
جو دل میں ہے زباں پر بھی وہی ہے
جو پوشیدہ وہی ہیں برملا ہوں
بھٹکتا پھر رہا ہوں کوچہ کوچہ
کسی گم گشتہ شے کو ڈھونڈتا ہوں
تو اپنائے نہ اپنائے ترا کام
میں تیرا ہوں بُرا ہوں یا بھلا ہوں
جہاں کی ہر بلا گزری ہے مجھ پر
جہاں کی ہر بلا سے آشنا ہوں
بڑا مکّار ہے مضطر زمانہ
زمانے کی میں رگ رگ جانتا ہوں

زہے نصیب کہ دیدار اُن کا عام ہوا
جو آج تک نہ ہوا تھا وہ صبح و شام ہوا

ہر ایک کام کا پہلے سے ہے مقرر وقت
مقرّرہ وقت سے پہلے نہ کوئی کام ہوا

کچل دیئے ہیں زمانے نے میرے احساسات
نہ میں ہوا کبھی غمگیں نہ شادکام ہوا

نہ بھولا پھر وہ مزا تجھ سے ہم کلامی کا
جو ایک بار کوئی تجھ سے ہم کلام ہوا

غضب ہیں رزق یہ دینے کے ڈھنگ اے رزاق
کہ دانے میں پوشیدہ ایک دام ہوا

مجھے نہ تاکہ شکایت ہو اب تغافل کی
وہ مہرباں بھی ہوا تو برائے نام ہوا

نگاہِ لطف تھی ساقی کی کاشفِ اسرار
جہاں نما مئے صافی سے میرا جام ہوا

تمام ہو گئی عمرِ گریز پا مضطر
مگر نہ کارِ محبت ابھی تمام ہوا

اُس مہوش سا کوئی یہاں خوب رُو نہیں
اور اس پہ طرّہ یہ کہ تکبّر کی بُو نہیں
یا دلکشی نہیں کوئی اب کی بہار میں
یا عالمِ نبات میں جوشِ نمو نہیں
اے شیخ مندروں میں خموشی سہی مگر
اب مسجدوں میں بھی تو کہیں ہا و ہُو نہیں
میں ہیچ کس ہوں تجھ سے مرا کیا مقابلہ
مجھ کو ہے تیری تجھ کو مری جستجو نہیں
یہ ہے غلط خیال اُسے بالائے طاق رکھ
یہ مت سمجھ کہ تجھ سا کوئی خوبرُو نہیں
دل میں جو میل ہو تو نہیں یار یار بھی
دل صاف ہو اگر تو عدو بھی عدو نہیں
اس حال میں سمجھتا ہوں جینا فضول ہے
تیری نظر میں میری اگر آبرُو نہیں
مضطرؔ نہ پوچھ اُس بُتِ کافر کا مجھ سے حال
مدّت ہوئی کہ اُس سے کوئی گفتگو نہیں

کچھ کم کسی سے میری عداوت میں تو نہیں
تیرا عدو وہی ہے جو میرا عدو نہیں
وہ انجمن نہیں کوئی ماتم کدہ ہے وہ
جس انجمن میں جلوہ گرا ے دوست تو نہیں
گلشن میں چھپائے گی مجھ سے نہ بات کر
میرے بدن میں دوڑتا پھرتا لہو نہیں
تیرے بغیر کس کو ہے لطفِ سکوں نصیب
وہ کون ہے کہ جس کو تری جستجو نہیں
ہر در پہ سائلانہ کھڑا کس لئے رہوں
ہر پا پہ سر جھکاؤں میں یہ میری خُو نہیں
اے دل سرشت داد کے قابل اسی کی ہے
ہوتا کبھی عدو سے بھی جو دُو بدُو نہیں
ہم بس کرے جو بیچ بچاؤ وہ کون ہے
مضطر کسی کے بس کا بھی وہ تند خُو نہیں

بقید یک قافیہ

مقدّر اپنا کام آیا بھی تو کس وقت کام آیا
نہ حسرت ہی رہی پینے کی جب باقی نو جام آیا
بقدر ظرف ہر میخوار کے حصّے میں مے آئی
رہا کوئی نہ تشنہ کام جب گردش میں جام آیا
دیا ساقی نے اس کو جو ہوا لینے پہ آمادہ
لپک کر لے لیا جس نے اسی کے ہاتھ جام آیا
یہ بختِ نارسا کا قہر سا اک قہر تھا ہمدم
کہ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا لب تک نہ جام آیا
ہمارے ہی نصیبوں میں نہ تھا عیش و طرب ساقی
اِدھر محفل سے ہم اُٹھے اُدھر گردش میں جام آیا
کبھی یوں بھی ہوا ساقی سے مانگے پر نہ کچھ پایا
کبھی ایسا بھی وقت آیا کہ بن مانگے ہی جام آیا
یہاں خوش دیکھ کر کوئی کسی کو خوش نہیں ہوتا
زمانہ جل گیا جوں ہی ہمارے ہاتھ جام آیا
ہم ان حالات میں کس دل سے مضطرؔ شاعری کرتے
کہ محفل اُٹھ گئی جس وقت ہم تک دورِ جام آیا

واہی جب تک نہ کیا دیدۂ بینا ہم نے
جلوۂ یار سرِ طور نہ دیکھا ہم نے
اپنی تقدیر کا الزام کسی کو کیا دیں
جیسا بویا تھا یہاں ویسا ہی کاٹا ہم نے
درد میں تیرے مزا رنج میں تیرے راحت
تیری فرقت میں بھی اک لطف سا پایا ہم نے
جوشِ مستی میں قدم دشتِ جنوں کو جو اُٹھے
خاک سے ذرّوں کو دی وسعتِ صحرا ہم نے
تیرے اخلاص کے از بس ہیں فسانے مشہور
تجھ سا مخلص نہ جہاں میں کوئی دیکھا ہم نے
جھک گئی فرطِ محبت سے نگہ اُن کے حضور
بارہا یوں بھی کیا عرضِ تمنّا ہم نے
پھر ندامت بھی وہی پھر سے خطائیں بھی وہی
اپنے ماضی سے سبق کوئی نہ سیکھا ہم نے
کٹ گئی اپنی تو کانٹوں میں اُلجھ کر مضطر
باغِ عالم سے کوئی پھول نہ توڑا ہم نے

زیست دشوار ہوئی جاتی ہے
غم سے لاچار ہوئی جاتی ہے
گزر اوقات نہیں تھی آساں
چارو ناچار ہوئی جاتی ہے
زندگی عیش و طرب تھی جو کبھی
اب وہ آزار ہوئی جاتی ہے
وہ کسی بات پہ آتے ہی نہیں
روز تکرار ہوئی جاتی ہے
کیف آور ہے کسی کی صحبت
رُوح سرشار ہوئی جاتی ہے
حاکمِ وقت کی ہے نیند حرام
خلق بیدار ہوئی جاتی ہے
مضطرؔ اس دورِ ہوس پرور میں
عاشقی خوار ہوئی جاتی ہے

اے ہمصفیر ہم پر لازم ہے فکرِ گلشن
ہم سب کی آبرو ہے گلشن کی آبرو میں
شائستگی مقدم ہے شرعِ عاشقی میں
ڈرتا ہوں کہہ نہ جاؤں کچھ جوشِ آرزو میں
ہر منظرِ حسیں پر تیرا گماں گزرا
میں تجھ کو دیکھتا ہوں دنیائے رنگ و بو میں
کچھ سخت بھی ہو کہنا تو بھی ہو نرم لہجہ
دل مت دکھے کسی کا اثنائے گفتگو میں
کیوں اب نہیں پھڑکتی تیری رگِ حمیت
اے دل جمود آیا یہ کیا تیرے لہو میں
تو جانے یا نہ جانے دنیا تو جانتی ہے
میں خاک ہو گیا ہوں تیری ہی آرزو میں
گرما سکے گا کیوں کر تو اپنی انجمن کو
مے ہی نہیں رہی جب ساقی ترے سبو میں
وہ زندگی ہی مضطر شایانِ زندگی ہے
کٹ جائے زندگی جو منزل کی جستجو میں

ایسے جینے میں خاک لذت ہو
جس میں مرنے کی بھی فرصت ہو
عقل انساں سے کچھ نہیں بنتا
ساتھ جب تک نہ اس کی رحمت ہو
اتنی تیزی بھی کیا طبیعت میں
کہ ہر اک کو تری شکایت ہو
میں بھی خدمت گزار ہوں تیرا
میرے لائق بھی کوئی خدمت ہو
کیسے آئے نظر اُسے خوبی
عیب جوئی کی جس کو عادت ہو
کیا کبھی وہ بھی وقت آئے گا
جبکہ تجھ کو بھی قدرِ الفت ہو
پیٹھ پیچھے تو سب ہی کہتے ہیں
منہ پہ کہنے کی تجھ میں جرأت ہو
تیری نیکی کی اک ہے یہ پہچان
نیک بندوں سے تیری صحبت ہو
سب کو رہنا ہے جب یہاں مضطر
کیوں کسی سے کسی کو نفرت ہو

کیا ہے کس نے خوش سارے جہان کو
ہوا ہے کون خوش سارے جہان سے
وہ ساری خاک میں اب مل گئی ہیں
جو اُمیدیں تھیں میرِ کارواں سے
یہ پستی اور وہ اپنی بلندی
کہاں یہ آگئے ہیں ہم کہاں سے
بہت کچھ کہہ لیا تو نے سنبھل اب
نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے
یہ روز و شب کی گردش کہہ رہی ہے
کوئی بجلی گرے گی آسماں سے
تجھے اچھا کہا ہے جس زباں نے
بُرا کیسے کہوں اب اُس زباں سے
نہ جانے کیا بلا ہے آنے والی
نظر آتے ہیں وہ کچھ سرگراں سے
حیاتِ مختصر اے مضطر اپنی
کہیں اچھی ہے عمرِ جاوداں سے

غم زدہ ہوں محرمِ دردِ نہاں کوئی نہیں
حالِ دل کس سے کہوں ہیں رازداں کوئی نہیں
میرے غم میں اب نہیں کوئی شریکِ غم مرا
شادمانی پر مری اب شادماں کوئی نہیں
اب کہاں سے لاؤں وہ سچی محبت کی خوشی
جانستاں ملتے ہیں لیکن جاں فشاں کوئی نہیں
تجھ کو کیا معلوم کیا ہے زندگی تیرے بغیر
رات دن بے چین ہوں آرامِ جاں کوئی نہیں
زندگی میں اب نہیں باقی کوئی کیف و سرور
زندگی بے کیف ہے اب کیف ہاں کوئی نہیں
تیرے مرنے سے مری ہر خواہشِ دل مر گئی
آج گویا مجھ کو شوقِ این و آں کوئی نہیں
میرے گھر کی ساری رونق ایک تیرے دم سے تھی
اب یہ گھر ہے سونا سونا وہ سماں کوئی نہیں
توڑ ڈالا تونے یہ کس وقت پیمانِ وفا
ضبطِ غم کی جب مجھے تاب و تواں کوئی نہیں
سجدہ ہائے شوق میرے ہو چکے مضطر تمام
اب محبت کی جبیں کا آستاں کوئی نہیں

کس قدر غمناک ہیں شام و سحر تیرے بغیر
آہ یہ دنیا ہے سونی کس قدر تیرے بغیر
زندگی اک بوجھ بن کر رہ گئی میرے لئے
مشکل ہے اب یہ بڑھاپے کا سفر تیرے بغیر
کوئی کہہ سکتا نہیں اس زندگی کو زندگی
کر رہا ہوں زندگی جو میں بسر تیرے بغیر
اب جہاں کی کوئی شئے اچھی نہیں لگتی مجھے
ہوگئی دنیائے دل زیر و زبر تیرے بغیر
گھر اگر گھر تھا تو یہ تھا ایک تیری ذات سے
اب کہوں میں کس طرح اس گھر کو گھر تیرے بغیر
تیرے ہونے سے یہاں ہر چیز میں تھی دلکشی
کاٹتے ہیں مجھ کو یہ دیوار و در تیرے بغیر
آج میں جو اس طرح لاچار ہوں مجبور ہوں
ہوگیا ہے میرا یہ حالِ دگر تیرے بغیر
مضطرؔ غمگیں پہ رحمت ہو خدائے پاک کی
غم کی ہے تصویر وہ اب سر بسر تیرے بغیر

نہ جب ہیں مرسد کا جور و جفا سے
مجھے مارا گیا مہر و وفا سے
بری ہوتی ہیں مظلوموں کی آہیں
اگر ڈر ہے تو ڈر قہرِ خُدا سے
مجھے معلوم تھا انجام اپنا
میں سب کچھ جانتا تھا ابتدا سے
تجھے آرایشِ گیسو سے مطلب
کوئی مرتا ہے تو تیری بلا سے
کسی صورت بھی مرجھائی کلی پہ
نہ آئی تازگی بادِ صبا سے
مرے سب کام بگڑے اور بنے ہیں
تری رحمت سے اور میری خطا سے
ہجومِ صد بلا ہے اب جو نازل
دعائے خیر مانگی تھی خدا سے
عجب بے چین ہے مضطر طبیعت
کسی کے وعدۂ صبر آزما سے

اَب جفا کو کوئی جفا نہ کہے
بات سچّی بھی برملا نہ کہے

میں نے اب تک تمہیں بُرا نہ کہا
تاکہ دنیا تمہیں بُرا نہ کہے

جُرم نظّارہ کوئی جُرم نہیں
اِس خطا کو کوئی خطا نہ کہے

تیرے بس میں ہو جس کی مرگ و حیات
وہ تجھے اپنا کیوں خدا نہ کہے

کوئی دے یا اُسے نہ دے کوئی
حرفِ ناخوش مگر گدا نہ کہے

تجھ سے انصاف کی توقع کیا
تو بُرے کو بھی جب بُرا نہ کہے

ہائے مجبوریاں محبت کی
کیا کہے کوئی ان سے کیا نہ کہے

اچھا تب ہے کہ جب بجائے ترے
منتظر اچھا تجھے زمانہ کہے

محبت کی یہ مجبوری تھی جو ایسا کیا اکثر
نہ جانا تھا جہاں ہم کو وہاں جانا پڑا اکثر

خدا محفوظ رکھے تجھ کو ہر آسیب دنیا سے
میں جان و دل سے تیرے حق میں کرتا ہوں دعا اکثر

ہوئے ہیں رونما سنگیں نتائج کی وہ صورت میں
بڑی معصوم تھی جن سانحوں کی ابتدا اکثر

خدا جانے یہ کیا دستور ہے اپنائے عالم کا
بھلا جس کا کیا میں نے برا اس نے اکثر

نہیں ہوتا بسا اوقات وہ سونا حقیقت میں
نظر آتی ہے جو ہر شے چمکتی خوشنما اکثر

مزا جب ہے فراغت میں تجھے یاد خدا آئے
مصیبت میں تو کرتا ہے ہر اک یاد خدا اکثر

زمانے کی روش کے ساتھ جو چلتا نہیں مضطر
زمانے کی روش نے کر دیا اس کو فنا اکثر

ایسے انساں جہاں میں کم ہیں
جن کے غم بھی جہان کے غم ہیں
تو ہمارے تضاد پر مت جا
ہم فقیروں کے لاکھ عالم ہیں
ابتدا ہم نے کی تھی یا تم نے
پھر گنہگار تم ہو یا ہم ہیں
کون جینا حرام کر چھوڑے
زندگی سے تو سینکڑوں غم ہیں
یوں تو ہونے کو سب کی ہیں آنکھیں
لیکن اہلِ نظر بہت کم ہیں
چھوڑ رنج و ملال کی باتیں
دیکھ ہم لوگ اب کوئی دم ہیں
اُن کو سمجھے تو کوئی کیا سمجھے
گاہے شعلہ ہیں گاہے شبنم ہیں
جان ہے تو جہان ہے مضطر
محفلیں بھی تبھی ہیں جب ہم ہیں

آج ہیں پھول تو ہیں پتھر کل
یہ بھی اک ریت ہے زمانے کی
بھول جا ہر ستم زمانے کا
بخش دے ہر خطا زمانے کی
اگلے وقتوں میں جو میسّر تھی
وہ فراغت نہیں اب آنے کی
جب وہ سُن کر بھی اَن سُنی کر دے
پھر ضرورت ہی کیا سُنانے کی
خیر گلشن کی مانگ ارے ناداں
خیر اس میں ہے آشیانے کی
صاف کہہ دوں گا دل میں جو ہوگا
مجھ کو عادت نہیں چھپانے کی
خود بخود آگئیں بہاریں سب
دیر تھی ایک تیرے آنے کی
آتشِ عشق بھی بجھی ہے کبھی
لاکھ کوشش کرو بجھانے کی
آزمائے ہوئے کو اے مضطر
کیا ضرورت ہے آزمانے کی

کوئی سبیل ہو چارہ گرو خدا کے لئے
سکون و صبر نہیں جان مبتلا کے لئے

غضب ہے عشق میں کوئی نہیں رضا کے لئے
کوئی وفا کے لئے ہے کوئی جفا کے لئے

کیا ہے پیار ہی میں نے کوئی گنہ تو نہیں
یہ آپ دیتے ہیں ایذائیں کس خطا کے لئے

بھلائی جبکہ میانہ روی میں ہے تو بشر
نہ ابتدا کے لئے ہے نہ انتہا کے لئے

جھکی جھکی یہ نگاہیں فقط نہیں کافی
کچھ اور چاہیئے شوخی نری حیا کے لئے

بقا نصیب کسے کارگاہِ ہستی میں
ہر ایک چیز بنی ہے یہاں فنا کے لئے

تمنا کرتے ہو تم ترکِ مدعا کی، مگر
جگر تو پیدا کرو ترک مدعا کے لئے

قبول جب نہ ہوئی مضطر ایک بار دعا
کبھی نہ اٹھے مرے ہاتھ پھر دعا کے لئے

اب کے برس جو آئے گی چھبیس جنوری
تن من مرا جلائے گی چھبیس جنوری
پھروں تمہاری یاد میں آنسو بہاؤں گا
جب سوگوار آئے گی چھبیس جنوری
بیتے دنوں کی یاد دلائے گی پھر مجھے
تڑپائے گی رلائے گی چھبیس جنوری
لے جائے گی وہ چھین کے صبر و سکوں مرا
یہ قہر مجھ پہ ڈھائے گی چھبیس جنوری
تازہ ہوا کریں گے مرے زخم ہر برس
اک طرفہ گل کھلائے گی چھبیس جنوری
مجھ کو ملول پائے گی پھر بھی اسی طرح
جب اگلے سال آئے گی چھبیس جنوری
مضطر یونہی جو آتی رہے گی تو ایک دن
بس جان لے کے جائے گی چھبیس جنوری

نہ پوچھ مجھ سے مرے غمگسار حال مرا
کہ آشکار ہے چہرے پہ سب ملال مرا
وہ دن بھی تھے کہ بڑے چین سے گزرتی تھی
یہ دن بھی ہیں کہ ہے جینا بھی اب وبال مرا
عروج دیکھا بہت تو نے عمر بھر کے لئے
پلٹ کے دیکھ کسی وقت اب زوال مرا
تمہاری برسی جو گزری تو میں نے یہ جانا
گزر گیا ہے مصیبت کا ایک سال مرا
نہ پایا راحت و آرام جب کہیں موجود
تو عیشِ رفتہ کی جانب گیا خیال مرا
بہار اس میں نہ آئے گی اب نہ آئے گی
کیا ہے موت نے گلزار پائمال مرا
اب اور جینے کی حسرت نہیں رہی مضطر
خدا کرے کہ ہو جلدی کہیں وصال مرا

جو میرے لئے تیری محفل نہیں
تو میرا بھی دل آج وہ دل نہیں
نہیں اہلِ دنیا سے الفت جسے
وہ دنیا میں رہنے کے قابل نہیں
مری زندگی ہے سفر در سفر
مرے واسطے کوئی منزل نہیں
بشرطیکہ عالی ہو ہمت تری
کوئی کام دنیا میں مشکل نہیں
مقدر مرا ساتھ دے یا نہ دے
تدبر سے ہرگز میں غافل نہیں
میں ناشاد ہوں مجھ کو دلشاد کر
یہ تیرے لئے کوئی مشکل نہیں
ازل سے ہے محدود ہر شے مگر
محیطِ تصور کا ساحل نہیں
محبت میں مضطر ہے جی کا زیاں
کچھ اس کے سوا اور حاصل نہیں

یہ حسن یہ بہار یہ چمنستاں رہے
یارب مدام جلوۂ لالہ رخاں رہے
زیرِ زمیں رہے کہ سرِ آسماں رہے
تیرا خیال ساتھ رہا ہم جہاں رہے
جو بار یاب ہو نہ سکے تیری بزم میں
وہ بدنصیب جائے کدھر اور کہاں رہے
تو دستگیر ہو تو تلاطم کا خوف کیا
کشتی کسی غریب کی کیوں درمیاں رہے
اس سے غرض نہیں کہ رہیں یا نہ ہم رہیں
اس سے غرض ہے اپنی یہاں داستاں رہے
ہم جانتے تھے چونکہ حقیقت کے راز کو
حلقہ بگوشِ حضرتِ پیرِ مغاں رہے
کرتا ہوں تیرے حق میں دعائیں میں اے اندن
تو کامراں تو شادماں تو جاوداں رہے
مضطر یہ اپنی زندہ دلی کا ہے فیض سب
اس سال خوردگی پہ کبھی جو ہم جواں رہے

ایسا بھی کوئی ہے جو نہ بھٹکا ہو راہ سے
انسان ہو کے کون بچا ہے گناہ سے
آتی رہی ہیں مشکلیں ایسوں کی راہ میں
ہٹ کر چلے جو لوگ زمانے کی راہ سے
ہوتی نہیں کہیں سے بھی حق کی صدا بلند
مسجد سے، بُت کدہ سے، درِ خانقاہ سے
ہر چند پھول توڑنا واجب نہ تھا مگر
پھولوں کا ہم نے چوس لیا رس نگاہ سے
جو کچھ کسی نے مانگ لیا اس کو مل گیا
خالی گیا نہ کوئی تری بارگاہ سے
بھائی نہ جانتے تھے کہ کل کوئی قافلہ
لے جائیگا نکال کے یوسف کو چاہ سے
پہلی نظر کا فیصلہ ہوتا نہیں درست
انساں کی پرکھ ہوتی ہے مضطر نباہ سے

محرم نہ ہو سکیں گے وہ رازِ کمال کے
دیکھے نہیں جنہوں نے کبھی دن زوال کے

اک تیرا التفات مداوا کرے گا کیا
اسباب اور بھی ہیں ہمارے ملال کے

اب تیرے دردمندوں کا عالم ہی اور ہے
شناکی ہیں ہجر کے نہ وہ طالب وصال کے

ہر جھوٹ پر گزرتا ہے سچ کا گمان اب
لاتے ہیں لوگ جھوٹ کو سانچے میں ڈھال کے

اُن کو زمانہ چھوڑ کے آگے نکل گیا
جو چل سکے نہ ساتھ زمانے کی چال کے

اُس بدگماں کو میری وفا کا نہیں یقیں
کیسے دکھاؤں اپنا کلیجہ نکال کے

دنیا میں ایک جنگ بپا ہے خیال کی
کچھ حق میں ہیں تو کچھ ہیں مخالف خیال کے

یہ جانتا اگر تو نہ کہتا میں حالِ دل
نادم ہوا ہوں بات کو منہ سے نکال کے

پیر مغاں کے دستِ مبارک کا جام ہے
مضطر ذرا سنبھال کے مضطر سنبھال کے

شملے کی مال روڈ کا میں حال کیا کہوں ہر شام اک ہجوم ہے حُسن جہاں کا

اِس شہر نگاراں میں ہے حُسن کا یہ عالم جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہر جا یہاں مناظرِ قدرت ہیں بیشمار حیرت قدم قدم پہ نہ ہو کیوں نگاہ کو

الوداع اے شملے کے دلکش نظارو الوداع
الوداع اے جاں فزا رنگیں بہارو الوداع
الوداع اے دیو قامت دیو دارو الوداع
الوداع اے اونچے اونچے کوہسارو الوداع
الوداع اے نغمہ پیرا آبشارو الوداع
الوداع اے کوہستانی جوئبارو الوداع
الوداع اے رُوح پرور سبزہ زارو الوداع
الوداع اے خوبصورت مرغزارو الوداع
الوداع اے شام کے رنگیں نظارو الوداع
الوداع اے رات کے تاباں ستارو الوداع
جا رہا ہوں پھر مگر آنے کی حسرت دل میں ہے

کچھ بھی دشوار نہیں کام کا آساں ہونا
شرط اوّل ہے مگر ہمتِ مرداں ہونا

جبکہ پردے میں بھی ہے حُسن کی جلوہ پاشی
پھر تماشا ہے یہ کیا حُسن کا پنہاں ہونا

اُس جفا کار سے کیا کوئی توقع رکھے
جس کو آیا نہ جفاؤں پہ پشیماں ہونا

دلِ برباد کے انجام پہ رونا آیا
تھا مقدر خانۂ آباد کا ویراں ہونا

صاف آجاتے ہیں پہلے ہی سے آثار نظر
جس بیاباں کی ہو قسمت میں گلستاں ہونا

مشغلے اہل جنوں اور بھی رکھتے ہیں بہت
ایک ہی شغل نہیں چاک گریباں ہونا

مضطر اس نکتۂ زرّیں کی حقیقت کو سمجھ
کہیں بہتر ہے فرشتے سے اک انساں ہونا

ہم تھے کہ تیرے وعدۂ فردا پہ ٹل گئے
موہوم سی اُمید اک لے کر بہل گئے

کیفیت اب عجب ہے دلِ دردمند کی
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل گئے

ہو جائے گا سنبھلنا رہِ عشق میں محال
جب ایک بار آپ کے پاؤں پھسل گئے

رہتے نہیں کسی کے شب و روز ایک سے
بدلا اگر نصیب تو دن بھی بدل گئے

اس مختصر سی زندگی کو کیا کرے کوئی
حیف ایسی زندگی پہ کہ آج آئے کل گئے

کم ظرف ہیں حریف کوئی کیا انہیں کہے
دلشاد مجھ کو دیکھ کر کم بخت جل گئے

اس سنگدل کی آنکھ بھی لیکن نہ تر ہوئی
رُوداد میری سُن کے تو پتھر پگھل گئے

مضطر خیالِ مرگ کا آنا ہے قدرتی
جب دیکھتا ہوں کتنے ہی احباب چل گئے

دستۂ گل

نویدِ وصل جو پیغامِ یار ہو نہ سکا
قرار بخشِ دلِ بے قرار ہو نہ سکا
نہ عندلیب ہی چہکے نہ کوئی گل مہکا
بہار پر بھی گمانِ بہار ہو نہ سکا
زباں تنگ ہی رہی دوستوں کی ہمدردی
کسی کا درد سے سینہ فگار ہو نہ سکا
جو تیرے لطف و کرم تھے شمار سے باہر
مرے گناہوں کا بھی کچھ شمار ہو نہ سکا
یہ کیوں کہوں کہ کسی کو بھی سازگار نہیں
زمانہ مجھ سے اگر سازگار ہو نہ سکا
گلہ فضول ہے تجھ سے ترے تغافل کا
مجھی سے اور ذرا انتظار ہو نہ سکا
اگرچہ رندوں سے یاری بہت رہی منظر
میں رند بن نہ سکا بادہ خوار ہو نہ سکا

کرتا ہے وہ بُت جتنا ستم اور زیادہ
دلدادہ ہوئے جاتے ہیں ہم اور زیادہ
آتا ہے فنا ہونے پہ جب کوئی ستمگر
ڈھاتا ہے وہ دنیا پہ ستم اور زیادہ
جمہور کی آواز دبائے نہ دبے گی
اُٹھیں گے بغاوت کے علَم اور زیادہ
ہر حال میں جب شکر ہی لازم ہے خدا کا
ہیں ایک برابر مجھے کم اور زیادہ
کیا تم نے عزیزوں کا رویہ نہیں دیکھا
دُھراؤ نہ بس قصۂ غم اور زیادہ
تقدیس جو قائم نہ رہی دیر و حرم کی
نظروں سے گرے دیر و حرم اور زیادہ
جتنا کہ طلبگار رہا عیش کا مضطرؔ
اتنا ہی ہوا کشتۂ غم اور زیادہ

گُل کو نہ باغ میں نہ بیاباں میں خار کو
میں دیکھتا ہوں صنعتِ پروردگار کو

جب میں قفس میں ہوں تو مجھے کیا بہار سے
اے ہمصفیر آگ لگے اس بہار کو

آنکھوں میں ہے نمی تو لبوں پر ہے خامشی
کیسے چھپائے کوئی غمِ آشکار کو

غم کی گھڑی بھی میں نے خوشی سے گذار دی
میں جیت ہی سمجھتا رہا اپنی ہار کو

دیتا ہوں تیرے ہجر میں سو سو تسلّیاں
آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو

کیا جانے ہو گزر ترا کس راہ گزار سے
میں دیکھتا ہوں شوق سے ہر راہ گزار کو

مضطر وہ التفات پہ مائل ہوئے تو ہیں
اب وقت ہے نکالئے دل کے غبار کو

کب تک نہ جور و جبر کا شکوہ کرے کوئی
کب تک نہ دل کے غم کا مداوا کرے کوئی

پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی
پھر زخمِ تیغِ غم کی تمنا کرے کوئی

پردے سے بھی عیاں ہو اگر پرتوِ جمال
پھر کیوں نگاہِ شوق سے پردا کرے کوئی

حق گوئی آج جرم کی حد تک ہے ناروا
خیریت اس میں ہے کہ نہ لب وا کرے کوئی

ڈالے نہ ہم کو کشمکشِ انتظار میں
جھوٹا نہ ہم سے وعدۂ فردا کرے کوئی

بس میں نہ ہو اگر دلِ شیدائے آرزو
کس حوصلے پر ترکِ تمنا کرے کوئی

مضطر یہ سب درست کہ جی سے جہان ہے
جی سے اگر ہو تنگ تو پھر کیا کرے کوئی

بڑھی اُن سے جتنی محبت زیادہ
ہوئی مجھ کو اتنی شکایت زیادہ
بڑھاؤ نہ اپنی ضرورت زیادہ
کہ بڑھتی ہے اُس سے مصیبت زیادہ
بنی نوعِ انساں کی خدمت سے بڑھ کر
نہیں اور کوئی عبادت زیادہ
ذرا روئے روشن سے زلفیں ہٹا دے
کہ پھیلی ہے دنیا میں ظلمت زیادہ
قناعت سے بڑھ کر نہیں کوئی دولت
ہے سب دولتوں سے یہ دولت زیادہ
نہ اچھا ہے دُنیا سے دل کا لگانا
نہ اچھی ہے دُنیا سے وحشت زیادہ
سبب اپنی ناکامیابی کا مضطر
تدبر ہے کم اور قسمت زیادہ

دِل سے اُمیدِ وصل ابھی تک گئی نہیں
ہر چند کوئی وصل کی صورت رہی نہیں
یہ تو نہیں کہ حُسن میں اب دل کشی نہیں
رونا ہے یہ کہ عشق میں دیوانگی نہیں
کیا کر دیا طلسم دل حق شناس نے
غم کا جو غم نہیں تو خوشی کی خوشی نہیں
یہ حُسن یہ بہار یہ رنگینیاں ہیں کیا
دل ہی نہیں تو دہر میں کچھ دلکشی نہیں
اس ناصبور دل کی تسلّی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے لطف میں کوئی کمی نہیں
یہ تو نہیں کہ مجھ پہ عنایت نہیں تری
لیکن خطا معاف کبھی ہے کبھی نہیں
ہے شاعری کا مرتبہ مضطر بہت بلند
وہ شاعری نہیں کہ جو پیغمبری نہیں

وجود اُن کا سیہ دھبہ ہے دامانِ محبت پر
جو مرتے ہیں بجائے حُسنِ سیرت حُسنِ صورت پر

مرے آگے کوئی جب نام لیتا ہے محبت کا
تو میرا دل لرز جاتا ہے انجامِ محبت پر

نظر انداز ہو سکتی نہیں محنت بھی قسمت بھی
میں قائل بھی ہوں محنت کا تو شاکر بھی ہوں قسمت پر

ضرورت میں نہ دے جو ساتھ تیرا دوست وہ کیسا
وہی ہے دوست کام آتا ہے جو وقتِ ضرورت پر

زمانے کے تغیر کا گلہ بے کار ہے مضطر
زمانہ رہ نہیں سکتا ہمیشہ ایک حالت پر

داغِ دل تابدار ہو نہ سکا
رازِ غم آشکار ہو نہ سکا
منکرِ ذات میں نہیں لیکن
زہد میرا شعار ہو نہ سکا
نعمتیں بے شمار پا کر بھی
شکرِ پروردگار ہو نہ سکا
تیرے آنے پہ بھی تعجب ہے
دل کو حاصل قرار ہو نہ سکا
وقت پر کوئی بھی نہ کام آیا
دوستوں پہ مدار ہو نہ سکا

ملنے کا کیا مزا ہے کوئی یوں اگر ملے
دل سے نہ دل ملے نہ نظر سے نظر ملے
بڑھتے ہی اور بڑھ گئیں آپس کی رنجشیں
ایسے جدا ہوئے کہ نہ پھر عمر بھر ملے
دنیا کا ڈر ہو دل میں تو ملنے کا لطف کیا
تم کیا ملے جو چاروں طرف دیکھ کر ملے
پہنچا سکا نہ منزلِ مقصود تک کوئی
ملنے کو راستے میں بہت راہبر ملے
ظاہر ہے دل میں کوئی کدورت ضرور ہے
جب بھی ملے وہ مجھ سے بہت مختصر ملے

لازم ہے کچھ بہار کا سامان بہار میں
ہو جائے ایک جشنِ بہاراں بہار میں
میں تو یہی کہوں گا کہ وہ کورِ ذوق ہے
کرتا نہیں جو چاکِ گریباں بہار میں
رندانِ بادہ خوار تو ٹھہرے ہی بادہ خوار
پینے کا شیخ کو بھی ہے ارمان بہار میں
ننگِ بہارِ گلشنِ ہستی ہیں ہیں وہ لوگ
جن کو ہے عذرِ تنگیِ داماں بہار میں
مضطر زمانے بھر سے ہے الٹا ترا چلن
کافر رہا خزاں میں مسلماں بہار میں

ہوا جذبِ محبت کا اثر آہستہ آہستہ
وہ ظالم راہ پر آیا مگر آہستہ آہستہ
شبِ غم کاٹنے والے ذرا جی کو کڑا کر لے
شبِ غم ہو ہی جائے گی بسر آہستہ آہستہ
زیادہ دیر تک باطل کی تاریکی نہ رہ پائی
حقیقت آگئی سب کو نظر آہستہ آہستہ
زمانے کی روش کو دیکھ کر اچھا کیا ہم نے
بدل لی ہی روش اپنی اگر آہستہ آہستہ
مرے ہمراہ منزل تک کوئی جا سکا مضطر
سبھی دم توڑ بیٹھے ہم سفر آہستہ آہستہ

زیرِ زمیں گیا کہ سرِ آسماں گیا
تیرا خیال ساتھ گیا میں جہاں گیا
کیفیتِ بہار کی حسرت ہی رہ گئی
فصلِ بہار آئی نہ دورِ خزاں گیا
مجھ بدنصیب کو نہ کہیں بھی اماں ملی
ہر سر زمیں پہ ساتھ مرے آسماں گیا
محسوس اب ہوا ہے ملاقات جب ہوئی
جو وقت تجھ سے دور کٹا رائیگاں گیا
مضطر تم انکے سامنے کیوں گنگ ہو گئے
وہ جوش وہ خروش تمہارا کہاں گیا

ملے خدا دینا تھا جو ذوقِ تماشا مجھ کو
ساتھ ہی کیوں نہ دیا دیدہ بینا مجھ کو
فکرِ امروز ہو کیوں بارِ غم فردا مجھ کو
تیری رحمت پہ ہے ہر وقت بھروسا مجھ کو
جو بھی مل جائے کسی سے ہے محبت میں قبول
گویا آیا ہی نہیں حرفِ تقاضا مجھ کو
بات کرنیکا نہ خود جن کو سلیقہ آیا
بات کرنیکا سکھاتے ہیں سلیقہ مجھ کو
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے مضطر
لوگ کہتے ہیں محبت کا ہے سودا مجھ کو

الٰہی وہ بہاروں میں مرا مہمان ہو جائے
بہاروں کے منانے کا کوئی سامان ہو جائے
اگر تم مشکلوں میں زندگی کرنے کی خو کر لو
تو ہر مشکل تمہارے واسطے آسان ہو جائے
نہ چھیڑو تم سمجھ کر دل کو محض اک خون کا قطرہ
کہیں ایسا نہ ہو یہ قطرہ اک طوفان ہو جائے
کہیں کا بھی نہیں رہتا نہ دنیا کا نہ دیں کا وہ
ذلیل اپنی نگاہوں میں اگر انسان ہو جائے
تو ایسے شعر کہہ مضطر کہ جن میں ہو جھلک تیری
[illegible]

اس دل سودائی کو ہرگز نہ دیوانہ کہو
عقل کا اندھا کہو اور گانٹھ کا پورا کہو
یہ مثل مشہور ہے جیسا کہو ویسا سُنو
اور یہ بھی ٹھیک ہے جیسا سنو ویسا کہو
میں تو پانی ہی کہونگا پانی کو ہر حال میں
تم اسے قطرہ کہو چاہے اسے دریا کہو
اس جہانِ رنگ و بو کی جب حقیقت تم نہیں
اس جہانِ رنگ و بو کو کیوں نہ پھر دھوکا کہو
یہ دلِ ناکام کب تدبیر سے غافل ہوا
اس دلِ ناکام کو تقدیر کا مارا کہو

ہوئی طے عشق کی منزل یہاں تک
فغاں سے آ گئے ترکِ فغاں تک
بہت نادم ہوا میں دل ہی دل میں
اگر شکوہ کبھی آیا زباں تک
وہ جن کے نام کا بجتا تھا ڈنکا
نہیں ملتا کہیں اُن کا نشاں تک
تم ایسی ایسی باتیں کر رہے ہو
مجھے جن کا نہ تھا وہم و گماں تک
نہ رکھ مضطر بھروسہ دوستوں پر
کہ اُن کی دوستی ہے امتحاں تک

بزمِ جمالِ یار ہمارے لئے نہیں
یہ حُسن یہ بہار ہمارے لئے نہیں
تیرا ضمیر ہی تجھے پھٹکارتا ہے اب
ہرگز تو شرمسار ہمارے لئے نہیں
اپنی مصیبتوں کا ہے رونا ہر ایک کو
کوئی بھی اشکبار ہمارے لئے نہیں
آنکھیں ہیں فرشِ راہ تری غیر کے لئے
تو محوِ انتظار ہمارے لئے نہیں
مضطرؔ ہزار شغل تھے عہدِ شباب میں
اب کوئی کاروبار ہمارے لئے نہیں

ترا جو اہلِ وفا سے یہی سلوک رہا
وفا کا نام نہ لے گا کوئی زمانے میں
غریب کو بھی میسر ہوں نعمتیں تیری
کمی ہے کیا مرے داتا ترے خزانے میں
اسے قفس کی مصیبت کا حال کیا معلوم
خوشی سے جس نے گزاری ہو آشیانے میں
اُسی کے حکم سے چلتا ہے یہ نظامِ جہاں
کوئی مخل نہیں قدرت کے کارخانے میں
تلاشِ رزق میں خطرے ہیں لاکھ اے طائر
ازل سے دام ہے پوشیدہ دانے دانے میں

رکھتا ہوں جمع حسرت و ارماں نئے نئے
تسکینِ دل کے کرتا ہوں ساماں نئے نئے

تو ہی اسیرِ خوفِ خزاں ہو کے رہ گیا
تیرے لئے کھلے ہیں گلستاں نئے نئے

اپنے ہر ایک تجرم کی تکمیل کے لئے
رستے نکال لیتا ہے انساں نئے نئے

تھی چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات
اُبھرے اُبھرنے کو مہِ تاباں نئے نئے

مضطر علاجِ دردِ جگر ہو ہی جائے گا
ہر درد کے ہیں سینکڑوں درماں نئے نئے

شوخی کی ہے نہ اُس نگہہ فتنہ زا کی ہے
تقصیر کوئی ہے تو دلِ مبتلا کی ہے

پی کر کبھی میں قضا نہیں کرتا نمازِ شام
قائل ہیں میرے روح کسی پارسا کی ہے

آتی ہے لفظ لفظ سے بوئے وفا مجھے
ہر چند یہ نوشت کسی بیوفا کی ہے

سمجھو نہ یہ کہ کوئی سمجھتا نہیں تمہیں
رُوداد ہر زباں پہ تمہاری وفا کی ہے

کیا صدق حق پرست ہی ہوتے ہیں تلخ گو!
مضطر ترے کلام میں تلخی بلا کی ہے

یہ رشتے ہیں جھوٹے ہمارے تمہارے
نہ ہم ہیں تمہارے نہ تم ہو ہمارے
عجب سلسلہ ہے وجود و عدم کا
کبھی اس کنارے کبھی اُس کنارے
مجھے اپنی ہمت پہ کامل یقیں ہے
کہ کشتی لگے گی یقیناً کنارے
مصیبت کے دن اور جدائی کی راتیں
گزارے جو کوئی تو کیوں کر گزارے
ہر اک بات واضح ہے قدرت کی مضطرؔ
سمجھتا نہیں تو ہی غیبی اشارے

اس دورِ انحطاط میں وہ فکر و فن کہاں
ملتے ہیں آشنائے رموزِ سخن کہاں
سنتے ہیں ہم بھی دار و رسن کی حکایتیں
لیکن ہیں اس زمانے میں دار و رسن کہاں
چلتا ہوں راہِ شوق میں ہر نبرزد کے ساتھ
مجھ کو تمیزِ راہبر و راہزن کہاں
مرغِ چمن تجھی کو مبارک ہو فصلِ گل
ہم بے بسوں کو رغبتِ سیرِ چمن کہاں
کل جس کے تحت سینکڑوں سُولی پہ چڑھ گئے
مضطرؔ وہ آج جذبۂ حبِ وطن کہاں

تیرے آنے کو ہم بقا سمجھے
تیرے جانے کو ہم فنا سمجھے
دیکھ خوش فہمیاں محبت کی
ہم جفا بھی تری وفا سمجھے
ہم ترے حسن کی تجلی کو
مظہرِ شانِ کبریا سمجھے
وہی اچھے رہے یہاں جو لوگ
درد کو دردِ کی دوا سمجھے
وہ کفی مضطر ضمیر کی آواز
تم ہی لیکن نہ یہ صدا سمجھے

تو نے دیکھے ہی نہیں جی سے گزرنیوالے
سر ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں مرنیوالے
کیا ڈبوئے گی تو لے موجِ حوادث اُن کو
ڈوب کر بھی اُبھر آتے ہیں اُبھرنیوالے
کام کچھ جراتِ بیباک ہی آ سکتی ہے
کام کچھ کر نہ سکے سائے سے ڈرنیوالے
کٹ گئی عمر گرانمایہ یونہی بے صرفہ
نہ کئے اصل میں جو کام تھے کرنیوالے
گفتگو تیری تو ایسی نہیں دلکش مضطر
شعر تیرے ہیں مگر دل میں اُترنیوالے

دہر میں دلگیر دیکھے ہیں بہت دلشاد کم
مبتلائے رنج و غم ہیں بے شمار آزاد کم

نالہ و فریاد اے دل عشق میں واجب نہیں
عشق میں کرتے ہیں اے دل نالہ و فریاد کم

خانۂ دل کو مرے ظالم نہ یوں برباد کر
بستیاں اُجڑی ہوئی ہوتی ہیں پھر آباد کم

جلوہ گاہِ حسن میں پیلے بہت شیریں بہت
خارزارِ عشق میں ہیں قیس کم فرہاد کم

یوں تو استادی کا دم بھرتے ہیں اے مضطر بہت
ہم نے دیکھے ہیں وفا جیسے مگر استاد کم

تیری تجلّیوں کی کسے آرزو نہیں
ایسا ہے کون جس کو تری جستجو نہیں

اُس انجمن میں اے دلِ ناداں نہ جا کبھی
جس انجمن میں کچھ بھی تری آبرو نہیں

یوں دیکھنے کو ہے گُل خوش رنگ ہر حسین
لیکن کسی میں کچھ بھی محبت کی بُو نہیں

مدّت ہوئی کہ بند ہے سب کاروبارِ عشق
عرصہ ہوا کہ اُن سے سرِ گفتگو نہیں

قسمت تو گو بُری ہے طبیعت بُری نہیں
مضطر ہے زشت حال مگر زشت خو نہیں

اُن کا دیدار خاص عام ہوا
جو نہ ہونا تھا صبح و شام ہوا
جتنا دوڑا ہیں وقت کے پیچھے
وقت اتنا ہی تیز گام ہوا
آج نکلے ہیں بن سنور کر وہ
آج سامانِ قتلِ عام ہوا
وقت بدلا تو لوگ بھی بدلے
دورِ نو کا نیا نظام ہوا
مضطرؔ آنے لگا جو لطف سفر
زندگی کا سفر تمام ہوا

تیری جانب سے اشارا اور تھا
ہاں مگر میں نے ہی سمجھا اور تھا
لوحِ پیشانی پہ لکھا اور تھا
ہو گیا کچھ اور ہونا اور تھا
اب زمانے کا چلن کچھ اور ہے
جو زمانہ ہم نے دیکھا اور تھا
اور ہے ہر ذہن میں صورت تری
ہر نظر میں تیرا نقشا اور تھا
مضطرؔ آخر مل گئے منزل پہ ہم
تیرا رستہ اور میرا اور تھا

کس کو تھا معلوم پامالِ خزاں ہو جائیگی
زندگی جس کو بہارِ جاوداں سمجھا تھا میں
کیا خبر تھی موردِ برقِ بلا ہو جائیں گے
چار تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں
میری بدنامی و رسوائی کا باعث ہو گئے
آہ جن لوگوں کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں
ہر نفس ہر لحظہ اپنا آپ تھا میں محتسب
زندگی کو اک مسلسل امتحاں سمجھا تھا میں
تھی جوانی میں بھی مضطر کس بلا کی خودسری
لوگ سمجھاتے رہے لیکن کہاں سمجھا تھا میں

بزمِ مے میں بھی ترے مستوں کو یہ ہوش رہا
لڑکھڑا کر جو گرے پاؤں جما کر اُٹھے
قصۂ دردِ محبت جو سنانے بیٹھے
آپ بھی روئے ہم اُن کو بھی رُلا کر اُٹھے
اک طرح رنج بھی ہے اور خوشی بھی دل کو
ہم تری بزم سے غیروں کو اُٹھا کر رکھے
بزم میں بیٹھے تو وہ عشق بداماں بیٹھے
اور جب اُٹھے تو وہ حشر اُٹھا کر اُٹھے
اس قدر غیر ہے اب حال ترے مضطر کا
سب کے سب دیکھ کے رحمت کی دعا کر اُٹھے

تر شیخ جی نے ریش عبث کی خضاب میں
تبدیل ہو سکا نہ بڑھاپا شباب میں
دل ہی ملا کچھ ایسا مشیت سے دردمند
دیکھا گیا نہ مجھ سے کوئی اضطراب میں
دنیا کو بے سبب نہیں رغبت شراب کی
آخر کوئی تو فائدہ ہو گا شراب میں
تیری تجلیوں کی کسے تاب تھی یہاں
اچھا ہوا کہ تو رہا پنہاں نقاب میں
مضطر بچا ہے کون غم روزگار سے
راحت کسے ملی ہے جہانِ خراب سے

ستم بھی روا ہے کرم بھی روا ہے
محبت کی دنیا میں سب کچھ بجا ہے
مروت کسی میں نہ مہر و وفا ہے
الٰہی زمانے کو کیا ہو گیا ہے
مقدر میں تھا جو مجھے مل گیا ہے
نہ اب کچھ شکایت نہ کوئی گلہ ہے
نہ معلوم وہ دوست ہو یا کہ دشمن
محبت کے پردے میں کوئی چھپا ہے
نگاہِ کرم اپنے مضطر پہ رکھو
تمہارا ہی ہے وہ برا یا بھلا ہے

وہ جور پیشہ ہمارا غم آشنا نہ ہوا
اکارت آہیں گئیں نالہ بھی رسا نہ ہوا
تو اُنکے وعدے پہ شاداں تو ہے دلِ ناداں
بنے گی جی پہ یہ وعدہ اگر وفا نہ ہوا
ہر ایک سہو و خطا درگزر کی میں نے
بُرے بُروں کا بھی مجھ سے کبھی بُرا نہ ہوا
درِ مراد ہوا وا تو ہمتوں سے ہوا
درِ مراد کبھی منتوں سے وا نہ ہوا
تو اپنی خو پہ ہے قائم میں وضع پر اپنی
میں بیوفا نہ ہوا تو جو باوفا نہ ہوا

زباں سے صدمۂ فرقت بیاں نہیں ہوتا
جو درد دل میں نہاں ہے عیاں نہیں ہوتا
سوالِ سجدہ نہیں بات ہے عقیدت کی
مقام سجدے کا ہر آستاں نہیں ہوتا
وہ دِل جو غم میں بھی رہتا تھا شادماں اکثر
خوشی کے وقت بھی اب شادماں نہیں ہوتا
ہزار وعدہ خلافی ہو لاکھ دل شکنی
نیاز مند کبھی بدگماں نہیں ہوتا
زباں سے دل کی وکالت نہ ہو سکی مضطر
کسی کا حال کسی سے بیاں نہیں ہوتا

ہر خوشی ہے جہاں کی غم انجام
اس لئے ہر خوشی سے ڈرتا ہوں
نہ ڈراتا ہوں میں کسی کو کبھی
نہ میں خود ہی کسی سے ڈرتا ہوں
کون جانے کہ کل کو کیا ہوگا
کس لئے آج ہی سے ڈرتا ہوں
خوف دشمن کی دشمنی کا نہیں
دوست کی دشمنی سے ڈرتا ہوں
غم تجھے مار ہی نہ دے مضطر
میں تری خامشی سے ڈرتا ہوں

کیا ہوا آپ کی عادت ہے جو پردا کرنا
چشم بینا کو بھی آتا ہے تماشا کرنا
حسن کرتا ہے اگر عشق کو رسوا تو کرے
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
تم مداوائے غم عشق کرو یا نہ کرو
ننگ ہے بہر مداوا مجھے لب وا کرنا
تم بلا خوف و خطر چاہنے والوں سے ملو
اہل دنیا کا تو ہے کام ہی چرچا کرنا
میں تو ہر حال میں راضی برضا ہوں مضطر
میں نے سیکھا ہی نہیں قسمت کا شکوا کرنا

بھلے انسان کرتے ہیں بھلائی
بروں کا کام ہے کرنا برائی
تمہاری آنکھ کو جب نم نہ پایا
بہت رویا کوئی وقتِ جدائی
میں سمجھا کوئی شے تقدیر بھی ہے
نہ جب تدبیر میرے کام آئی
خدا کی حکمتوں کو کون جانے
برائی میں بھی ہو شاید بھلائی
کسی دن اُن کا دامن تھام لوں گا
یہی اب دل میں ہے مضطر سمائی

بجا کہ زر ہے ضروری بسر گذر کے لئے
مگر روا نہیں غیرت کا خون زر کے لئے
نہیں ضرور کہ ہر روز ہو نیا جلوہ
تجلی ایک ہی کافی ہے عمر بھر کے لئے
قفس کو توڑ کے پرواز کر فضاؤں میں
اسیری اک بڑی لعنت ہے بال و پر کے لئے
یہ کائنات جو تیرے لئے جہنم ہے
بہارِ حسن کی جنت ہے دیدہ ور کے لئے
خلوص دل سے دعا ہو تو کیوں اثر نہ کرے
اگر دعا کے لئے ہے دعا اثر کے لئے

زمانے کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر
ترے در پہ آیا ہوں رنجور ہو کر
محبت کا وہ امتحاں لے رہے ہیں
کبھی پاس آ کر کبھی دور ہو کر
مجھے اس قدر بھی نہ مجبور کر دے
کہ سچی سنا دوں میں مجبور ہو کر
تجھے دیکھتا ہوں میں ہر زاویے سے
کبھی پاس ہو کر کبھی دور ہو کر
یہی جی میں آتا ہے دن رات مضطر
پڑے رہیے اس در پہ معذور ہو کر

رکھتا ہوں ایک حسن کی دنیا نگاہ میں
رہتا ہوں رات دن میں تری جلوہ گاہ میں
دیکھا نگار خانۂ ہستی کو اس طرح
ہر حسن جذب کر لیا میں نے نگاہ میں
آسان ہے زباں سے کہنا کسی کو دوست
مشکل مگر ہے پورا اترنا نباہ میں
شاہ و گدا کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
سب جھک گئے جب آ کے تری بارگاہ میں
مضطر قدم قدم پہ شگفتہ تھے پھول بھی
تو ہی الجھ کے رہ گیا کانٹوں سے راہ میں

یہ تو نہیں کہ ذوقِ تماشا نہیں مجھے
مشکل ہے یہ کہ تو نظر آتا نہیں مجھے

رہنے دو مجھ کو گوشۂ عزلت میں دوستو
شہرت کی زندگی کی تمنا نہیں مجھے

گاتا ہوں پھر بھی شام و سحر زندگی کے گیت
ہر چند زندگی کا بھروسہ نہیں مجھے

کچھ بات ہے کہ لب نہ کھلے ان کے رو برو
ورنہ گلے شکایتیں کیا کیا نہیں مجھے

سب چاہیں جس کو اور سب اچھا کہیں جسے
ایسا تو کوئی بھی نظر آتا نہیں مجھے

گلہ کرتے رہے غیروں کا ہم اپنی تباہی پر
جو دیکھا تو نہیں پردا اک اپنا مہرباں نکلا

دلِ ناداں سمجھتا تھا بہت آساں منزل کو
سفر الفت کا لیکن سخت مشکل امتحاں نکلا

اسیرانِ قفس کو کیا غرض کیا واسطہ اس سے
کب آیا موسم گل اور کب دورِ خزاں نکلا

جہاں کی بندشوں سے مضطر آزادی کیسے حاصل
نہ تھا قیدِ قفس میں جو اسیرِ آشیاں نکلا

میں نے یہ کب کہا کہ اذیت نہیں قبول
سب کچھ مجھے قبول ہے ذلت نہیں قبول
دنیا میں اک مجھی ہو محبت سے بے نیاز
ورنہ ہے کون جس کو محبت نہیں قبول
انسانیت کا خون ہو جس کے حصول میں
مجھ کو وہ عز و جاہ وہ حشمت نہیں قبول
میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا
مضطر جسے نمایشِ الفت نہیں قبول

بس وہی تجھ سے ساقی میں جام چاہتا ہوں
اک صبح چاہتا ہوں اک شام چاہتا ہوں
باتیں اِدھر اُدھر کی تو کیا سُنا رہا ہے
اے نامہ بر میں اُن کا پیغام چاہتا ہوں
مضطر انہیں میسر ہوں راحتیں جہاں کی
اپنے لئے جہاں کے آلام چاہتا ہوں

وعدے پر آنے کو تو وہ آ گئے
آئے بہلانے کو اور تڑپا گئے
زندگی کی اُلجھنیں سلجھائے کون
فلسفی تو اور بھی اُلجھا گئے
ایسے بھی کچھ پھول گلشن میں کھلے
وقت سے پہلے ہی جو مرجھا گئے
جمع کرنے والوں نے کیا کر لیا
خوش رہے جو پی گئے یا کھا گئے

ہم کو نہ کوئی دہر میں بے مدعا ملا
تحصیلِ مدعا میں ہر اک مبتلا ملا
دنیائے دار و گیر کا حال زبوں نہ پوچھ
جو بھی ملا وہ بندۂ حرص و ہوا ملا
ہنستے تھے میرے حال پہ یارانِ تیز گام
یارانِ تیز گام سے آخر میں جا ملا

کیا کہوں وقت ترے ہجر میں کیوں کر گزرا
ہر نفس عمرِ خضر سے بھی گراں تر گزرا
دل میں اک حشر ہوا وہم و گماں کا برپا
آج تو غیر سے جب آنکھ چُرا کر گزرا
چھوڑ دیں آپ مجھے میری زبوں حالی پر
آپکے لطف و عنایات سے میں در گزرا
وادیٔ عشق کی دشواریوں کا حال نہ پوچھ
ایک سے ایک یہاں حادثہ بڑھ کر گزرا

رہ گئی عیب و ہنر میں نہ کوئی آج تمیز
عیب بھی سامنے آتا ہے تو اک فن ہو کر
ایسے دشمن سے ہو کیوں آپ کو شکوہ کوئی
دشمنی کرتا ہے جو آپ کا دشمن ہو کر
تیرا کس جگ میں بھلا ہوگا بتا اے مضطر
بت پرستی سے تجھے ضد ہے برہمن ہو کر

ہر بات کا جو اور ہی مطلب نکال لے
شکوہ کروں تو کیا کروں اس بدگمان کے پاس
صیّاد نے اک اور نکالی ستم کی راہ
رکھا مجھے بقیدِ قفس آشیاں کے پاس
اس کے مریدِ خاص کئی پارسا بھی ہیں
کیا جانے کیا کمال ہے پیرِ مغاں کے پاس
جی ڈھونڈھتا ہے کوئی مقامِ سکوں نیا
اس شور و شر سے دور کہیں آسماں کے پاس

مشاہدے کا سلیقہ تجھے اگر آئے
ہر ایک چیز بہ رنگِ دگر نظر آئے
ملا ہے مجھ کو دلِ دردمند کچھ ایسا
کسی کے اشک جو دیکھوں تو آنکھ بھر آئے
کسی پہ کھل نہیں سکتا یہ رازِ سربستہ
کسے خبر ہے کدھر جائیں گے کدھر آئے

اس سے بڑھ کر نہ کوئی اور اذیت جانو
جان کا سب سے بڑا روگ محبت جانو
ہر ستم کو کرم خاص سمجھتا ہوں مَیں
تم مرے شکر کو ہرگز نہ شکایت جانو
دولتِ صبر سے بڑھ کر نہیں کوئی دولت
دولتِ صبر کو سب سے بڑی دولت جانو
کل کا ہے تم کو بھروسہ نہ ہمیں اے مضطر
آج مل بیٹھنا آپس کا غنیمت جانو

کھلے بڑھاپے میں جو ہر مری طبیعت کے
وہ پھول ہوں جو کھلا موسمِ بہار کے بعد
میں چونک اٹھا ایک ایک آہٹ پر
ملا نہ چین مجھے شامِ انتظار کے بعد
ابھی سے چھوڑ نہ دل اے مسافرِ ہستی
چمن بھی آئے گا رستے میں خار زار کے بعد

بخت بد نے یہ ڈرایا ہے مجھے
کہ مناجات سے ڈر لگتا ہے
کل نہ حالات کی پروا تھی مجھے
آج حالات سے ڈر لگتا ہے
تھا کبھی دل میں ملاقات کا شوق
اب ملاقات سے ڈر لگتا ہے
کہیں محفل میں نہ رسوا ہو جائے
دل کی حرکات سے ڈر لگتا ہے

دولتِ دہر کی تقسیم برابر ہو جائے
کاش ہر مفلس و نادار تونگر ہو جائے
تیری قدرت کیلئے کچھ بھی یہ دشوار نہیں
تو اگر چاہے تو قطرہ بھی سمندر ہو جائے
جان اس کشمکشِ شام و سحر سے چھوٹے
کل کو جو ہونا ہے وہ آج ہی مقدر ہو جائے

اگر دنیا میں دیوانے نہ ہوتے
محبّت کے یہ افسانے نہ ہوتے
ارے نادان یہ ممکن نہیں تھا
نثارِ شمع پروانے نہ ہوتے
جو اپنوں کا رویّہ ٹھیک ہوتا
تو بیگانے بھی بیگانے نہ ہوتے
وہ کب سنتے مرے طعنوں کو مضطرؔ
مرے دشمن اگر کانے نہ ہوتے

نہ خوشامد نہ مجھے چرب زبانی آئی
مجھ کو آئی تو فقط صاف بیانی آئی
مجھ کو رو لینے دو جی بھر کے مرے غمخوارو
آج رہ رہ کے کوئی یاد پرانی آئی
منقطع ہو گئی سب اُن سے وفا کی اُمید
اک نئے موڑ پہ اب اپنی کہانی آئی

حسن رہتا نہیں کبھی مستور
خود نمائی پہ حسن ہے مجبور
تم ہی کہہ دو وفا شعاروں سے
بے وفائی بھی ہے کوئی دستور
لاکھ پردے ہوں حق پہ باطل کے
ظلمتوں سے نہ چھپ سکے گا نور
بے سبب وہ خفا نہیں مضطر
کچھ نہ کچھ ہے ضرور تیرا قصور

حسن کی شان ہے زیبائی و رعنائی میں
عشق کا مرتبہ ہے ذلت و رسوائی میں
وہ بھی اب ہو گئی بے تابیٔ دل سے پوری
کچھ کسر رہ گئی تھی جو مری رسوائی میں
مضطر اس انجمن آرا کی حضوری میں چلیں
چین اب دل کو نہیں گوشۂ تنہائی میں

عرضِ غم سے انہیں کر یوں نہ خفا اور کہیں
مجھ سے ہو جائے نہ یہ ایک خطا اور کہیں
تیرے در سے اُسے خیرات ملے یا نہ ملے
جا نہیں سکتا مگر تیرا گدا اور کہیں
جس نے یہ درد دیا ہے وہ دوا بھی دے گا
نہیں اس درد کی دُنیا میں دوا اور کہیں
تم کہاں مضطرِ گم گشتہ کی کرتے ہو تلاش
وہ نہیں ملنے کا اُس در کے سوا اور کہیں

اللہ اللہ نہ رام رام آئے
میرے لب پر ترا ہی نام آئے
گلستاں میں بہار آتے ہی
کتنے صیاد لے کے دام آئے
لمحہ بھر بھی نہ ٹھہرے وہ مضطر
آئے بھی تو برائے نام آئے

لازم ہے کچھ حجاب زمانہ خراب ہے
نکلو نہ بے نقاب زمانہ خراب ہے
دیکھی یہاں کسی کی بھی سیدھی نہ کوئی کل
اُلٹا ہے سب حساب زمانہ خراب ہے
پڑ جائے گی کسی نہ کسی کی بُری نظر
عریاں نہ کر شباب زمانہ خراب ہے
مضطر دیارِ عشق میں ہیں تہمتیں بہت
بچ کر چلیں جناب زمانہ خراب ہے

وقت کے حاکم کی مداح خوانی کرتا کس طرح
مصلحت اندیش تھا میں اور نہ دنیا دار تھا
انقلابِ دہر کی نیرنگیاں ہمدم نہ پوچھ
دیکھتے ہی دیکھتے گل کی جگہ پر خار تھا
یاد آتا ہے بہت مضطر ہمیں شام و سحر
دشمنوں کا دشمن اور یاروں کا مخلص یار تھا

تیری رحمت کی ہو بارش تو گلستانوں پر
قہر تیرا ہو جو نازل تو بیابانوں پر
اَب کسی کو نہیں اُمید بہار آنے کی
زاغ اور بُوم مسلط ہیں گلستانوں پر
چلن انسان کا بگڑا ہے کچھ ایسا اے دوست
کہ گماں ہوتا ہے شیطانوں کا انسانوں پر
بُت پرستوں کو نہ مخلوق خدا جو سمجھیں
مضطر ایمان نہ لا ایسے مسلمانوں پر

جذبِ اُلفت کا کچھ اُن پر بھی اثر ہے کہ نہیں
بے قراری جو اِدھر ہے وہ اُدھر ہے کہ نہیں
یہ تو معلوم ہے ہر شب کی سحر ہوتی ہے
یہ بتا و شبِ غم کی بھی سحر ہے کہ نہیں
بُجھ سکے جس سے نہ محنت کشوں کے پیٹ کی آگ
ایسے خرمن کے لئے کوئی شرر ہے کہ نہیں

بے کیف کیوں نہ ہوں مرے لیل و نہار اب
ماحول زندگی کا نہیں سازگار اب
فکرِ ادائے فرض رہا درکنار اب
احساسِ فرض بھی ہے طبیعت پہ بار اب
جی چاہتا ہے لوٹ لیں جی بھر کے اب بہار
شاید نہ زندگی میں پھر آئے بہار اب
مضطرؔ چھپائے چھپتے نہیں عشق اور مُشک
ہو کر رہے گا راز ترا آشکار اب

راہِ وفا میں دانش و حکمت بھی چھوڑ دے
دیوانگی بھی چھوڑ دے وحشت بھی چھوڑ دے
جب فائدہ ہی کچھ نہیں اظہارِ حال کا
ہر اک سے اپنے غم کی شکایت بھی چھوڑ دے
جب تُو نے ایک بار محبت ہی چھوڑ دی
مضطرؔ یہ تاک جھانک کی عادت بھی چھوڑ دے

کیا کیا حسین پھول کھِلے ہیں بہار میں
طوفانِ رنگ و بُو ہے بپا لالہ زار میں
نغمے مرے سُنائی دیئے دُور دُور تک
لیکن نہ کوئی سُن سکا قرب و جوار میں
ہر چند بات بات پر تو نے دیئے فریب
لیکن کمی نہ آئی مرے اعتبار میں
مضطر کسی کی نیکیوں کو جانتا ہے کون
مضطر یہ نیکیاں ہیں تری کس شمار میں

عجب مشکل میں ہوں وہم و گماں سے
نظر آتے ہیں وہ کچھ مہرباں سے
چمن کے رنگ سے ہے صاف ظاہر
کوئی بجلی گرے گی آسماں سے
جھکی ہے جو جبیں ہر آستاں پر
وہ ٹھکرائی گئی ہر آستاں سے

آتے ہی نامہ بر کے گلے سب نکل گئے
اُن کا پیام آیا تو ہم سر کے بل گئے

صدموں نے دل کو کر دیا ہے نرم اس قدر
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل گئے

تا دیر مجھ کو اپنی خوشی کا قلق رہا
جب دیکھ کر خوشی میں مجھے غیر جل گئے

مضطر نیا نظام ہے ہر بات ہے نئی
دیکھا کئے جو تم وہ زمانے بدل گئے

حکمِ حاکم ہے کہ گلخن کو میں گلشن سمجھوں
تجربہ کہتا ہے گلشن کو بھی گلخن سمجھوں

آزما کر نہ اُسے دیکھ لوں جب تک پہلے
غیر واجب ہے کہ راہبر کو میں راہزن سمجھوں

قشقہ کھینچا نہ کبھی آپ نے پہنا زنار
کس طرح آپ کو مضطر میں برہمن سمجھوں

نہ پوچھ کیسے کٹی تیرے بے قرار کی رات
بلائے جاں تھی قیامت تھی انتظار کی رات
غضب ہے قہر ہے دن رات کی یہ مجبوری
نہ اختیار کا دن ہے نہ اختیار کی رات
اُسی کی باتیں ہوں مضطرؔ اسی کا ذکر چلے
شبِ فراق ہے دراصل ذکرِ یار کی رات

ابھی نہ پہلے ہی خط کا جواب آیا تھا
کہ اضطراب میں خط اور لکھ دیا تجھ کو
وہ چالباز بلا کا ہے تفرقہ پرداز
عدو سکھاتا ہے تجھ کو الگ جدا تجھ کو
مجھے بھی کہنا پڑا بے وفا تجھے آخر
کہ سارے لوگ ہی کہتے ہیں بے وفا تجھ کو

اور ہیں وہ جو چھپاتے ہیں زباں سے دل کی بات
ہے وہی اپنی زباں پر جو ہمارے دل میں ہے
گھومتا پھرتا ہے مضطرؔ غم زدہ دل گیر سا
یوں نظر آتا ہے جیسے وہ کسی مشکل میں ہے

سب لوگ جسے کہتے ہیں ست جگ کا زمانہ
میں پوچھتا ہوں ایسا زمانہ کوئی تھا بھی
کب سے میں کھڑا راہ تری دیکھ رہا ہوں
اے دوست اگر تجھ کو ہے آنا تو اب آ بھی

کیا پوچھتے ہو یارو میں کس کو ڈھونڈتا ہوں
جلوہ دکھا کے کوئی روپوش ہو گیا ہے
میخانۂ جہاں کا کیوں کر نظام شد مرے
ہر ہوشمند مضطر مدہوش ہو گیا ہے

کوئی اک شخص ملا تھا مجھے اب یاد نہیں
قہر تھا یا وہ بلا تھا مجھے اب یاد نہیں
تم نے کچھ مجھ کو کہا تھا مجھے اب یاد نہیں
میں نے کچھ تم سے سنا تھا مجھے اب یاد نہیں
یاد ہوں آپ کو ماضی کی وہ باتیں شاید
کوئی اقرار ہوا تھا مجھے اب یاد نہیں

دولت اگرچہ قاضی الحاجات ہے مگر
اِک حد سے ہو زیادہ تو آفت ہے سیم و زر
ہوتے نہیں کسی کے یہ موقعہ شناس لوگ
ہوتے ہیں بس اُدھر کے ہوا کا ہو رُخ جدھر
مضطر اگر ہے پھولنے پھلنے کی آرزو
تو اختیار شیوۂ مکر و فریب کر

نظر جو شانِ خدا آئے دیکھ کر تجھ کو
تو پھر میں کیوں نہ کہوں جنّتِ نظر تجھ کو
درونِ پردہ بھی آئے نظر تجھے جلوہ
خدا نصیب کرے وسعتِ نظر تجھ کو
نہ جا کہ آنکھوں سے پیہم ہیں میرے اشک رواں
جھڑی لگی ہے مناسب نہیں سفر تجھ کو

جب میں نے کیا قصدِ گناہ دل نے کہا ہے
دیکھے نہ زمانہ تو خدا دیکھ رہا ہے
اِک وہ بھی ادا ہے تری اک یہ بھی ادا ہے
در اصل کوئی چیز فنا ہے نہ بقا ہے

سینۂ راز میں رکھا ہے بہت کچھ اس نے
پردۂ غیب سے معلوم نہیں کیا نکلے
دل کی تسکین کا باعث ہے جو صحبت تیری
کیوں تری بزم سے پھر کوئی تڑپتا نکلے
اہلِ ہمت کا یہی طرز رہا ہے مضطر
دم نکل جائے مگر سر سے نہ سودا نکلے

ویسے پینے کا میں نہیں عادی
اور مل جائے تو نہیں بھی نہیں
چشمِ ظاہر سے دیکھنے والو
یہ نہ سمجھو کہ وہ کہیں بھی نہیں
عاقبت کے لئے نہ دنیا چھوڑ
تیری دنیا نہیں تو دیں بھی نہیں

کسی کے جور و ستم کا گلہ ہو کیوں مجھ کو
بہانہ موت کا۔ آخر کوئی تو ہونا تھا
نہ منتوں سے ہوا کچھ نہ جبہ سائی سے
وہی ہوا مری تقدیر میں جو ہونا تھا

پنکھڑیاں

حال دُنیا کا سُنا جائے نہ دیکھا جائے
بہرہ ہو جاؤں خداوندیں اندھا ہو جاؤں

بگاڑنا ہے کسی چیز کا بہت آساں
اگر سنوارنا چاہو تو سخت مشکل ہے

یقین آئے گا کس کو خدا کی ہستی کا
کسی خطا کی کسی کو اگر سزا نہ ملے

کوئی اچھی چیز آسانی سے ہاتھ آتی نہیں
سینکڑوں کانٹے چبھے اک پھول کی خاطر مجھے

ساغر ہیں مے کو دیکھ کر ہی شادماں نہ ہو
ساغر کو لب تک آنے میں خطرے ہزار ہیں

قدر کرتی ہے مری تو زندگی میں قدر کر
زندگی کے بعد کی میں قدر کا قائل نہیں

تاجِ شاہی جو سر پہ رکھتا ہے
خوابِ راحت اُسے نصیب نہیں

غم کی افراط جو ہوتی ہے تو رو لیتا ہوں
داغ دل کے میں الگ بیٹھ کے دھو لیتا ہوں

آج تک ہم نے مقدر کا بہت کچھ دیکھا
دیکھئے اور دکھاتا ہے مقدر کیا کیا

دن رات سوچتا ہوں کہ جیتا ہوں کس لئے
جب میری زندگی کا کوئی مدعا نہیں

خدا جانے کہاں کی چھا گئیں مایوسیاں مجھ پر
کہ میرے دل کی دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے

اب آ گیا ہے تیرا سفر اختتام پر
مضطر نہ بیٹھ راہ میں تو ہمت ہار کے

پیری بجائے خود ہے اک آزار جان کا
اس پر ہو مفلسی بھی تو جینا حرام ہے

نہ دوستی ہے کسی سے نہ دشمنی مجھ کو
رہِ حبیب میں یہ اک نیا مقام آیا

بے راہ روی جو دل نے کبھی اختیار کی
روکا قدم قدم پہ اُسے دستِ غیب نے

بُرا ہے کوئی جو مضطر تو اس سے تجھ کو کیا
تو ذمہ دار ہے صرف اپنی ہی برائی کا

دشتِ غربت میں بسر کرتے ہوئے چین کے ساتھ
آنکھ بھر آئی مری جب کبھی گھر یاد آیا

نہ پوچھ کیسے کٹی تیرے انتظار کی شام
امید و بیم کی گھڑیاں گزار دیں ہم نے

راس آئی ہے مجھے حافظے سے محرومی
عہدِ ماضی کے سبھی رنج و محن بھول گئے

دیانتدار ہیں سب مہرباں موقعہ نہ پانے تک
یہ موقعہ پاکے رہ پائیں دیانتدار تو جانیں

اس بتِ کافر کی صورت دیکھ کر
دین بھی جاتا رہا ایمان بھی

کبھی جو دل میں آئی یاد آغازِ محبت کی
مری آنکھوں نے رو دیا خونِ انجامِ محبت پر

نہ پوچھو تم دلِ مضطر میں کیا کیا پیچ و تاب آئے
کسی جھوٹے کے وعدوں سے پڑا جب واسطہ مجھ کو

تنگ و دو زیست کی بڑھتی ہوئی جب دیکھتا ہوں میں
نمایاں اور ہوتا ہے مرا احساس کمزوری

چھپائے لاکھ کوئی پردۂ دل میں محبت کو
محبت کی نگاہیں راز افشا کر ہی دیتی ہیں

جہاں میں سنگریزوں کی کمی کوئی نہیں مضطر
بڑی مشکل سے ہوتے ہیں مگر لعل و گہر پیدا

جو دل پہ نقش تھے یاروں کے مدھم ہو گئے اب سے
تری صورت بھی آسانی سے پہچانی نہیں جاتی

بظاہر مراسم نہیں کوئی باقی
مگر دو دلوں میں محبت ہے ابتک
مجھے مشکل نہیں برداشت کرنا صدمۂ ہجراں
مگر ہے انتظار اک وہ سزا جو سہہ نہیں سکتا
سچ ہے تقدیر کا لکھا نہیں ٹلتا مضطر
جو بھی ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا اک دن
جد و جہد زندگی سے کوئی بچ سکتا نہیں
ہر کسی کو کام لازم ہے بقا کے واسطے
رکھتے ہیں ہم تناسبِ اعضا کا نام حُسن
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
مجھے دیکھو نہ چشمِ سُرمگیں سے
بڑی قاتل تمہاری یہ ادا ہے
دیدہ و دل کی ضیافت رنگ و بُو سے کر مگر
توڑنا پھولوں کا تیرے واسطے زیبا نہیں
موت کیا چیز ہے حیات ہے کیا
کیا خبر رازِ کائنات ہے کیا
میں کوئی چیز نہیں مانگنے آیا تم سے
مجھ سے اے دوستو تم آنکھ چُراتے کیوں ہو

جب تک نہیں دیکھا نہ تھا سو شوق تھے دل میں
اب اُن کو جو دیکھا ہے تو مایوس ہوا ہوں

وہ بے وفا ہے تو رہنے دے بے وفا اس کو
تُو اپنے فرض کو پہچان اور نبھائے جا

کس قدر معصوم ہے بچوں کی دنیا دیکھئے
ہر گناہ سے پاک ہر غم سے مبرا دیکھئے

گلشنِ ہستی میں کیا جانے چلی کیسی ہوا
پھول اس گلشن کے سارے یک بیک مرجھا گئے

جب وفادار کوئی مجھ سا نہ پایا تم نے
یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد

میں ہر شے ترک کرتا جا رہا ہوں
مری دنیا سکڑتی جا رہی ہے

گرتا ہوں تو گرنے دو مجھے یار کے در پر
سو مرحلے طے ہوتے ہیں اک لغزشِ پا سے

ہنر آتا نہیں اے دل تجھے مطلب براری کا
بگڑ جاتے ہیں اکثر کام تیری بے دماغی سے

کرے فکر و غم کس لئے کوئی مضطر
جو ہونا ہے ہو کر ہی آخر رہے گا

روتے والوں کی کٹی روتے ہی عمر
اور ہنسنے والے ہنستے ہی رہے

پُردرد و الم نکلے با دیدۂ نم نکلے
اس بزم سے کیا کہئے کس حال میں ہم نکلے

ہم پائمالِ جورِ فلک ہو کے رہ گئے
عزم و عمل کی قوتیں جو کھو کے رہ گئے

عہدِ پیری میں اب ہوا معلوم
تندرستی ہزار نعمت ہے

مضطر یہ دفعتہً تجھے کیا یاد آگیا
کیوں تیرے لب پہ شکوۂ بیداد آگیا

ساحل پہ ہیں جو آ لگا طوفاں بھی تھم گیا
گویا کہ میرے بازوؤں کا امتحان تھا

مصیبت آئے تو اے دل نہ گھبرا
کہ گھبرانے سے بڑھتی ہے مصیبت

درد کی بات جو سنتا ہوں کسی سے کوئی
جی بھر آتا ہے مرا اشک نکل جاتے ہیں

بھولے سے بھی کسی سے نہ کہہ دل کا راز تُو
ہر رازداں کو جان لے تیرا رقیب ہے

اگرچہ رسمِ عبادت کا میں نہ تھا پابند
ترے کرم کا مگر شکر صبح و شام کیا

سارے رنج و ملال بھول گئے
کٹ گئی جب غموں کی کالی رات

نہیں گلہ چمنیوں کی اب ہمیں کوئی ہوس مضطر
بہاریں ہم نے لوٹی ہیں بہت اگلی بہاروں میں

یہ تیری بھول ہے مضطرؔ جو تو بُرا سمجھے
خدا جو کرتا ہے تیرے بھلے کو کرتا ہے

نرمی سے نکلتے ہیں بہت کام جہاں میں
سختی کی بھی ہوتی ہے ضرورت کبھی لاحق

مجھے ہرگز نہیں انکار اُس طاقت کی ہستی سے
چلاتی ہے پس پردا سے جو اس کارخانے کو

غلط تھا میں نے جو سمجھا کہ کوئی بات نہیں
کہ لفظ لفظ کا دینا پڑا حساب مجھے

یار لوگوں سے تو کل تک تھی محبت مجھ کو
آج کیا جانئے کیوں ہو گئی نفرت مجھ کو

ضرور آئے گا وہ سنہری زمانہ
محبت کا دستور جب عام ہوگا

ہمیں بھی شوق تھا اُڑنے کا لیکن
نہ دی طاقت خدا نے بال و پر ہیں
سوال ہی نہ کسی سے کبھی کیا میں نے
نہیں تو ایک زمانہ کرم پہ مائل تھا

خود اپنی جان پر ہم رنج سہ لیتے ہیں اوروں کے
کسی کی جان کو لیکن کبھی ایذا نہیں دیتے
پینا تو شیخ بھی ہے اگر مفت کی ملے
مذہب میں اُس کے مول کی پینا حرام ہے

نہیں رہی جو کسی دوست کی مجھے پہچان
تو لگتا ہے مجھے بھی نہ کوئی پہچانے
کیا جانے کس وقت بجے کوچ کا گھڑیال
اک ڈر سا لگا رہتا ہے ہر وقت سفر کا

صدق دل سے دعا جو کی جائے
لازماً وہ قبول ہوتی ہے
یہ کارخانہ جہاں کا یونہی رہا چلتا
کسی کا کام نہ کوئی رُکا کسی کے بغیر
محبت کی نظر چھپتی نہیں ہرگز چھپانے سے
محبت کی نظر کے اور ہی انداز ہوتے ہیں

نہ آنا تھا نہ آئے آپ لیکن
یونہی وعدے سے ٹرخانا تھا مجھ کو

ذلّت یہ گوارا کسی کو ہو اُس در پہ رسائی پائے ہیں
جب غیرتِ عشق پہ چوٹ لگے پھر منتِ درباں کون کرے

زباں تو بند کر دی تو نے لیکن یاد رکھ ظالم
زباں سے بڑھ کے میری بے زبانی کارگر ہوگی

غزل بیشک ہو مضطر تو لاثانی ہے نظم اُن کی
مَیں شاگردِ وفا ہوں ناز ہے اُستاد پر مجھ کو

کل جو منعم تھے آج ہیں محتاج
انقلابات ہیں زمانے کے

قہرِ قدرت کا جو ہوتا ہے نزول
کرنا ہی پڑتا ہے بندے کو قبول

تصورات کی دنیا بھی خوب دُنیا ہے
کہ شادماں ہے دلِ زار دو گھڑی ہی سہی

مری نظر نے مجھے بارہا فریب دیئے
سراب نکلا جو دریا مجھے نظر آیا

جنابِ شیخ نے مے کے جواز میں یہ کہا
کہ مے جو ڈھنگ سے پی جائے تو حرام نہیں

اس جہاں میں سرِ نخوت نہ کرے کوئی بلند
آدمی کچھ بھی نہیں ذاتِ خدا کے آگے

نہ رہ پائے مضطر جو راحت کے دن
مصیبت کے بھی دن گزر جائیں گے

اُن کا پیغام اور خط آئے ہوئے
مدتیں گزریں زمانہ ہوگیا

روا داری نہیں اتنی بھی مضطر
کہ سُن لے بات ہی کوئی کسی کی

تجھ کو نہیں جو پاسِ محبت نہیں سہی
لازم نہیں کہ رسمِ مروّت بھی چھوڑ دے

حُسن کس چیز میں نہیں موجود
دیدہ ور ہی مگر نہیں کوئی

آؤ اب تو وقت ہے مضطر کی دلداری کرو
کون پوچھے گا تمہیں جب وقت ہی جاتا رہا

قیامت کا ہے شور و شر جوانی اور بچپن میں
بڑھاپے میں مگر ہے خامشی گورِ غریباں کی

میسّر ہم کو آسکتا تھا ریشم اور اطلس بھی
مگر کھدّر کیا اپنی خوشی سے زیبِ تن ہم نے

آتما موت سے نہیں مرتی
بلکہ چولا بدلتی رہتی ہے

تلوار کا بھی زخم نہیں اسقدر شدید
جتنا شدید ہوتا ہے مضطرؔ زبان کا

زبان تھی جو کبھی حالِ دل بتانے کو
وہی زبان ہے اب حالِ دل چھپانے کو

جو بہ مطلب کے بندے آج طاقت کے پجاری ہیں
کل ان کو دیکھنا ہونگے یہی طاقت کے دشمن بھی

جب یاد تری آجاتی ہے پہروں میں تڑپتا رہتا ہوں
اک ہوک سی دل سے اٹھتی ہے اِک درد جگر میں ہوتا ہے

جب مصیبت میں مرا کوئی سہارا نہ رہا
اپنی رحمت کا دیا تونے سہارا مجھ کو

بہت دُور ایک بستی پاک رُوحوں کی جو بستی ہے
پلٹ کر کیا وہاں سے تم کبھی واپس نہ آؤ گی

اب اس کی کرتے رہو تم ہزار تاویلیں
جو بات کہتی تھی وہ کہہ گئے اشاروں میں

وطن کو چھوڑ کر مضطرؔ نہ گھبرا
وطن میں کیا ہے غربت میں نہیں کیا

اک تجھی کو نظر آتا نہیں غافل ورنہ
ہر کسی کو ترا انجام نظر آتا ہے

نہ ضائع کرو وقت پچھتاؤ گے
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

میں بھوکوں جان دے سکتا ہوں پاس وضعداری سے
کسی کے آگے لیکن ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا

اے عزم وعمل کے متوالو تدبیر پہ کیا تم اتراتے ہو
تقدیر بھی جب تک ساتھ نہ دے تدبیر اکیلی کچھ بھی نہیں

تھا دیارِ غیر میں ہرگز نہ پاس ننگ و نام
خوب لوٹے شوق نے ناواقفیت کے مزے

کیا خبر تھی ایک دھوکا ہے ترا طرزِ تپاک
آہ تجھ کو پیکرِ صدق وصفا سمجھا تھا میں

آج تک پچھتا رہا ہوں حال دل کہہ کر تجھے
وائے نادانی تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں!

میں نے بے سود تجھے قول کا صادق سمجھا
تو ریاکار ہے لیکن مجھے معلوم نہ تھا

کبھی دیکھی تھی تم نے مسند شاہی پہ جو اُردو!
اب اُس اُردو زباں کی کس مپرسی دیکھتے جاؤ